کلیاتِ

سلیم واحد سلیم

مرتبہ

مسلم سلیم

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

کلیات سلیم واحد سلیم

مرتب

مسلم سلیم

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2014
تعداد : 550
قیمت : -/150 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1184

Kulliyat-e- Saleem Wahid Saleem

Edited By: Muslim Saleem

ISBN :978-93-5160-030-5

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔ کے آفسیٹ پرنٹرز، جامع مسجد، دہلی۔110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان کا اجتماعی شعور صدیوں کو محیط ہے۔اظہار کے سانچوں پر قابو پانے میں صدیاں لگی ہیں۔اظہار کے لسانی سانچے پر عبور پانا معجزے سے کم نہیں۔زبان کا سفر حقیقت سے مجاز تک کا نہایت بامعنی سفر ہے۔مجاز کے توسط سے اشارے حقیقت کی ترسیل ہیں۔مفروضے سے معروضے کی منزل مشاہدے سے تجربے کی منزل ہے جو پیچیدگی سے آسانی کی طرف لے جاتی ہے۔فکر سے اظہار اور اظہار سے تحریر کے مراحل میں ردوقبول سلسلہ جاری رہتا ہے۔جذبے، احساسات اور اشیا کی شناخت کے لیے لفظیات کا انتخاب اور ان کی قبولیت کے لیے زمانہ درکار ہوتا ہے۔زبان عمرانی، معاشرتی اور تہذیبی مظہر ہے۔ایک دن میں زبان بنتی ہے نہ قواعد۔نطق سے اظہار تک کا سفر صدیوں پر مشتمل ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس میں پیچیدگی اور تنوع پایا جاتا ہے۔زبان نامیاتی حقیقت ہے۔اسی لیے نئے نئے سیاق میں ظاہر ہوتی ہے۔ہر لفظ معنوی امکانات میں ایک سے زائد سیاق رکھتا ہے۔ہر لفظ اپنے ساتھ مختلف تصورات لے کر ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کی سادہ اور مجرد، دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ہر لفظ اپنی تخلیق کے بعد جب کچھ زمانی عرصہ گزار لیتا ہے تو اس کے معنوی حدود متعین ہو جاتے ہیں اور اس کی سند لغت فراہم کر دیتا ہے۔اردو نے اپنا

ادبی سفر شروع کیا تو تحریر بھی اسے محفوظ کرتی گئی اور آج اردو کتابوں کے عظیم ذخیرے پر ہم فخر کرتے ہیں۔

اردو میں مختلف علوم وفنون کی کتابوں کو منتقل کرنا اور معیاری تحریروں کو پکی روشنائی عطا کرکے اردو حلقوں تک پہنچانا ہماری اہم ذمہ داری ہے۔ کونسل نے متنوع موضوعات پر کافی کتابیں شائع کی ہیں۔ کلیات سلیم واحد سلیم کی اشاعت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب شاعری سے شغف رکھنے والوں کے لیے دلچسپ ہے۔ خوشی ہے کہ کونسل نے ایک اہم شعری ذخیرے کو محفوظ کرلیا ہے۔ امید ہے کونسل کی دیگر مطبوعات کی طرح اس کتاب کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
(ڈائرکٹر)

فہرست

	صفحہ
عرضِ مولف	VII
1. رنگ وسنگ (نظمیں)	1
2. سازِ غزل	141
3. فارسی کلام	269
4. خیامِ نو (عمر خیام کی رباعیوں کا منظوم ترجمہ)	305
5. ڈاکٹر سلیم واحد سلیم اپنے معاصرین کی نظر میں	425

عرضِ مولف

اردو ادب کا یہ سرسبز و شاداب چمن ان سینکڑوں ادیبوں، شاعروں اور قلم کاروں کی رعنائی فکر اور جولانئ قلم سے عبارت ہے،جنھوں نے ایک خاموش خدمت گار کی حیثیت سے اس کو سنوارنے اور اس کا معیار بلند کرنے میں اپنی توانائیاں صرف کردیں۔انھی خدمتگاروں میں سے ایک ڈاکٹر سلیم واحد سلیم (1921 تا 1981) تھے جنھوں نے نہایت خاموشی سے اردو کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔

ہندوستان کے کشمیری النسل بینکر خلیفہ عبدالواحد بینک آف تہران میں جنرل منیجر کے عہدے پر فائز تھے۔اسی دوران قاجاری شہزادی محترمہ فخر السادات سے آپ کا نکاح عمل میں آیا۔ان ہی کے بطن سے ڈاکٹر سلیم واحد سلیم،محترمہ اختر ملک اور محترمہ شمسی تولد ہوئیں۔ڈاکٹر سلیم واحد سلیم جب ۱۱ برس کے ہوئے تو یہ خانوادہ ہندوستان آ گیا۔محترمہ فخر السادات کو ہندوستان کی آب و ہوا راس نہیں آئی اور وہ جلد ہی اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئیں۔اس کے بعد ان تینوں بچوں کی پرورش کا ذمہ اعزہ نے اٹھایا۔ ڈاکٹر سلیم واحد سلیم کی کفالت،تعلیم و تربیت کا ذمہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی طبیہ کالج کے تاسیسی پرنسپل ڈاکٹر عطااللہ بٹ نے اپنے میرس روڈ والے بنگلے 'بٹ کدہ' میں کی۔('بٹ کدہ' پر رشید احمد صدیقی کا ایک مشہور لطیفہ بھی ہے)۔علی گڑھ سے

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم نے بی۔یو۔ایم۔ایس کیا۔ بعدۂ ڈاکٹر سلیم واحد سلیم اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گئے جہاں سے آپ نے ایم۔آر۔اے۔ایس کی ڈگری حاصل کی اور دریں اثنا بی بی سی میں فارسی اناؤنسر کی خدمات بھی انجام دیں۔

پیدائش کے بعد ۱۱ برس ایران میں مقیم رہنے کے سبب ڈاکٹر سلیم واحد سلیم کو فارسی اور فرانسیسی زبانوں پر کافی دسترس حاصل ہو گئی تھی کیونکہ فارسی آپ کی مادری زبان اور فرانسیسی ایران میں انگریزی کے مترادف کی حیثیت سے اسکولوں میں مروج تھی۔ اردو، انگریزی، عربی اور ہندی ڈاکٹر سلیم واحد سلیم نے ہندوستان آنے کے بعد سیکھیں۔

ایران کی طرب خیز و رومان پرور فضا میں اپنی زندگی کے سنہرے دن گذارنے کے بعد اس عظیم شاعر کو لاہور جیسی مردم خیز اور علی گڑھ جیسی اردو نواز فضاؤں میں سانس لینے کا موقع بھی ملا اور انگلستان کی خیرہ کن اور ہوشربا تہذیب نے ان کے مشاہدے کو جلا بخشی۔

تقسیم ہند سے قبل ہندوستان کے بیشتر ادبی رسائل میں پابندی سے شائع ہونے والے اس شاعر کو قیام پاکستان کے بعد وہاں کی سکونت اختیار کرنی پڑی اور ان کی معیاری تخلیقات پاکستان کے تمام تر ادبی جرائد کی زینت بنتی رہیں۔ 1970 کے بعد ڈاکٹر سلیم واحد سلیم ترک دنیا کر دیا اور گوشۂ گمنامی میں بیٹھ کر مطالعہ، تخلیق و تصنیف میں منہمک ہو گئے۔

طبع زاد شعر گوئی کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر سلیم واحد سلیم نے منظوم تراجم میں غیر معمولی مہارت اور چابکدستی کا ثبوت بھی دیا ہے۔ جس کا سب سے بڑا مظہر ہے ''خیام نو''۔ یہ عمر خیام کی 176 رباعیات کا ترجمہ مع ترمیم و اضافہ ہے اور اپنے وقت کے ماہرین مثلاً طفیل احمد اردو ادب میں ایک اضافہ ہے۔ علاوہ ازیں آپ نے تزک جہانگیری کا ترجمہ بھی فرمایا جو کافی پسندیدہ ہوا۔ آپ نے کچھ اور مشاہیر کی تخلیقات کے ترجمے بھی کیے جن میں شیکسپئر کے ڈرامے ''ہیملٹ'' کے ایکٹ 3 منظر 4، رابرٹ فروسٹ، ایملی ڈکنس، ڈبلو۔ایچ۔اوڈن، ماؤزے تنگ کی نظموں اور مختلف زبانوں کے گیتوں کے تراجم شامل ہیں۔ مثلاً ماؤزے تنگ کی نظم ''دختران چین''۔ ملاحظہ ہو۔

پوپھٹنے کا حسن ہیں یا صبح کی پہلی کرن
رائفل شانوں سے لٹکائے ہوئے نازک بدن

تابناکی اور شجاعت کی مثالی صورتیں،
دخترانِ چین ہیں کیسی مثالی صورتیں
مشق کا میدان ہو یا جنگ کا میدان ہو
کیوں نہ نصب العین پر ان کی نظر ہر آن ہو
جذبِ گیسو و کمر ان کی نظر میں ہیچ ہے
اطلس و دیبا نگاہِ معتبر میں ہیچ ہے۔
کوہ و صحرا ان کے قدموں سے شرف سامان ہیں
کاملیت کے یہ پیکر ہیں، عمل کی جان ہیں
عشق ان کو فرض سے اور انسیت وردی سے ہے
صنفِ نازک ہو کے بھی کام ان کو جواں مردی سے ہے۔

ڈبلو۔ ایچ۔ اوڈن کی نظم "خواب" کا ترجمہ دیکھیے۔

رکھ زندہ اسے ہو جو کوئی خواب توانا
آخر یہ کوئی سنگ و گِل و خاک نہیں ہے
افلاک کے نیچے تہہِ خورشیدِ جہاں تاب

خوش رنگ ہو جو سایۂ پر کربِ فنا میں
یا نیند نے تابندہ و مرغوب کیا ہو
یا ابرِ بہاراں نے بنا ڈالی ہو جس کی
تابش گہر اندازیِ باراں نے بھی دی ہو
ابھرا ہو جوانی کی طرب خیز افق سے
مستی کسی معصوم خراماں نے بھی دی ہو
یا ابھرا ہو پیری کی المناک فضا میں
جب رس ہو نہ مس ہو نہ کسی شوخ کی چھب ہو

ہو عمر کے موسم میں شبِ موسمِ سرما
ہر رنگ نئے کرب، نئے غم کا سبب ہو
اس وقت یہی دولتِ بیداریِ دل و ذہن
بس ایک یہی خواب بنا ہے گا ترا ساتھ
جو دورِ گذشتہ میں تباہی کہ خوشی ہو
ہر عہد میں گل ریز رہا اور رہا ساتھ
رکھ یاد، گل و سنگ بھی ہو جائیں گے گل خیز
یہ خوابِ بہاراں جو ترے ساتھ رہے گا
یہ خواب رہا ساتھ اگر تا دمِ آخر

دیکھیے عمر خیام کی رباعیوں کا طبعزاد ترجمہ کس سلیقے سے کیا ہے۔

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے عمر خیام کے مضامین کو بیسویں صدی کے تناظر میں ڈھال دیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم واحد سلیم نے دانستہ بحرِ طویل استعمال کی ہے جس سے زیادہ حسن پیدا ہو گیا۔

خیام:

حق جانِ جہانست و جہاں جملہ بدن
و اصنافِ ملائکہ حواسِ آن تن
افلاک عناصر و موالیدِ اعضاء
توحید ہمین است و دگرہا ہم فن

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم:

ہر زندہ بدن میں جاری ہیں امواجِ حیاتِ ربانی
قدسی ہیں حواسِ انسانی، ہر تن میں ظہورِ یزدانی
افلاک و عناصر اجزا ہیں ذی جان سب اس کے اعضا ہیں
ممکن ہی نہیں کچھ اس کے سوا توحید کی شکلِ امکانی

خیام:

از واقعہ ای ترا خبر خواہم کرد
واں را بہ دو حرف مختصر خواہم کرد
با عشقِ تو در خاک خرد خواہم شد

با مہر سوز خاک بر خواہم کرد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہستی کے چمن میں برگِ خزاں کی طرح میں جب ہو جاؤں گا
ہاں خاک کی چادر اوڑھ کے جب نظروں سے نہاں سو جاؤں گا
دیکھو گے تمھارے پیار نے پھر کس طرح سے آنکھیں کھولی ہیں
میں دیدۂ نرگس بن بن کر دیدارطلب ہو جاؤں گا

نظموں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر سلیم واحد سلیم کو غزل پر بھی مکمل عبور حاصل تھا۔ آپ کی زیادہ تر غزلیں ایک ہی لے اور آہنگ میں ہوتی تھیں۔ ایک غزل ملاحظہ ہو:۔

دستِ طلب نہ کر دراز جاہ و حشم نہ کر قبول
بن نہ گدائے روسیاہ دام و درم نہ کر قبول
تجھ پہ رہے یہ آشکار پست نہ ہو ترا وقار
جو تجھے مانگ کر ملے ناز و نعم نہ کر قبول
خود نہ لٹا سکے اگر گوہر و لعل و سیم و زر
ننگِ خودی ہے بخششِ اہلِ کرم نہ کر قبول
شکوۂ جورِ بیکراں کر نہ کبھی یہاں وہاں
بن کے حریفِ آسماں سوزشِ غم نہ کر قبول
زیست ہے کتنی مختصر وقفِ بہارِ غم نہ کر

لذتِ صبحِ عیش اٹھا شامِ الم نہ کر قبول
عظمتِ فقر پر نثار شان و شکوہِ قیصری
چن لے عرب کی سادگی شانِ عجم نہ کر قبول
دل میں خیالِ ماورا دیکھ سلیم آ نہ جائے
تو ہے خدا پرست اگر عشقِ صنم نہ کر قبول

فارسی کلام: چونکہ فارسی ڈاکٹر سلیم واحد سلیم کی مادری زبان تھی اس لیے آپ کے فارسی کلام میں کسی تکلف اور بناوٹ کا احساس نہیں ہوتا بلکہ میرے نزدیک ڈاکٹر صاحب کی فارسی غزلوں میں زیادہ زورِ بیان اور تنوع پایا جاتا ہے۔ مثلاً:۔

نہ ماند دل مگر آتش بہ قلب و جاں باقیست
تمام سوختم و برقِ بی اماں باقیست
صدائے کوسِ ظفر شعرِ ماست بہرِ بشر
نوائے فتحِ نفس ہائے ماست در عالم

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم ایک فعال ترقی پسند شاعر و ادیب تھے اور اپنے ہم عصروں بشمول فیض احمد فیض بہترین مراسم کے حامل تھے۔ لیکن جہاں بیشتر ترقی پسند حضرات معاند حالات میں روپوش ہو گئے یا سرگرمیوں میں کمی واقع ہو گئی ڈاکٹر سلیم واحد سلیم اپنے نظریات و افکار کا اظہار بہ بانگِ دہل کرتے رہے۔ پاکستان میں جب ان پر حکومت کی سختی بڑھ گئی تو اعزہ نے انھیں انگلستان بھیج دیا۔ لیکن وہاں بھی مغربی تہذیب اور سرمایہ دارانہ نظام پر ڈاکٹر سلیم واحد سلیم کے ادبی تیر و نشتر کی بوچھاریں جاری رہیں جس کی بہترین مثال ان کی لندن میں قلمبند طویل نظم ''ایک موسمِ سرما'' ہے۔ نتیجے کے طور پر حکومتِ برطانیہ کا رویہ بھی آپ کے تئیں سخت معاندانہ ہو گیا۔ واپس

پاکستان آکر ڈاکٹر سلیم واحد سلیم نے جنرل ایوب کی آمرانہ حکومت کے خلاف معرکہ آرا نظم ''خدایانِ جمہور کا فرمان'' قلمبند کی۔ اس کی اشاعت کے بعد حکومت نے ان پر ظلم وستم شروع کر دیے۔ اس کے باوجود انھوں نے ہار نہیں مانی اور تنِ تنہا بھوک ہڑتال کر کے حکومت سے لوہا لے لیا۔ یہ بھوک ہڑتال 13 دنوں تک جاری رہی اور آخر کار حکومت کی یقین دہانی کے بعد ختم ہوئی۔

ڈاکٹر سلیم ایک صاف ستھری، کھری اور سمجھوتوں سے مبرّیٰ 60 سالہ زندگی گذارنے کے بعد اس جہانِ فانی کو خیر باد کہہ گئے لیکن اپنے بے مثال کلام کے ذریعہ انھوں نے اپنی ذات کو لافانی بنادیا ہے۔

مسلم سلیم

رنگ وسنگ

(نظمیں اور موضوعاتی غزلیں)

مدح سرور کونین ﷺ

بزم امکاں میں ہے ہر سمت اجالا تجھ سے
رونق محفل ہستی ہے دوبالا تجھ سے
تیرے جلووں سے ہوئی ظلمت باطل کافور
ذرّے ذرّے میں ہے ایک برق تجلی تجھ سے
بیکسوں کے لئے تو بن کے سہارا آیا
لیتے ہیں بیکس و غم خوار سہارا تجھ سے
کس کے جلووں کی جھلک تھی ترے جلووں سے عیاں
غیرت طور ہوئی وادیٔ بطحا تجھ سے
ہوئی تخلیق ترے ہی لئے دنیائے وجود
دو جہاں آج بھی قائم ہیں تو تنہا تجھ سے
ہیں ترے نور کے دریوزہ گران ازلی
انجم و شمس و قمر میں ہے اجالا تجھ سے
کیوں نہ ہو تیری شفاعت کا طلبگار سلیم

2

دو جہاں کو ہے شفاعت کی تمنا تجھ سے

وہی رنگ ہے

سارے ہی موسموں میں وہی رنگ ہے

سردیوں کے ٹھٹھرتے ہوئے دن بھی یوں ہی گئے

وہ افق سے شفق تک کار ہر دو یونہی

نیل کے بیکراں شامیانے تلے

شرق تا غرب منزل بناتا رہا

منجمد یخ زدہ پتیوں

کوہساروں بیابانوں شہروں میں تابندگی

اور حرارت کے جاں بخش مخزن لٹا تا رہا

ساتھ روزانہ کی جادہ پیمائیاں

طول مدت میں پیہم گھٹا تا رہا

چاندنی بام و در سقف و میداں میں

عرش سے فرش تک رقص کرتی رہی

بستی بستی میں کھیت اور کھلیان میں

ذرے ذرے کے دل میں اترتی رہی

ننگے پیڑ اور پھلواریوں سے ملی

تو ہر اک پیڑ کے ریشہ و رگ میں تھی جھرجھری

پتے گرتے رہے دن گذرتے رہے

ایسے دن بھی کہ جب شامیانے تلے

دونوں تابندہ راہی قریب آ گئے

لیکن اس قرب کا ہر سراب نظر

اک نئی داستانِ الم کو جنم دے گیا

اور تابندہ راہی بچھڑتے رہے

اپنے محور کی گردش میں جکڑے ہوئے
اپنی ہی حد میں دن رات چلتے گئے
اور دن رات لمحوں میں ڈھلتے رہے
جلتے لمحے جو آندھی میں سگرٹ کے اڑتے دھوئیں
کی طرح سے گئے
اور نادیدہ منزل میں گم ہو گئے
اور یہ نادیدہ منزل مرا ذہن ہے
مرا ذہن ہے یا ترا ذہن ہے
یا یہ نادیدہ منزل کسی اور کا ذہن ہے
اور یہ لمحے جا کر پلٹتے نہیں
یاد بن کر پلٹنے کے اعجاز میں
بیتے دن آنے والے دنوں سے تو ملتے نہیں
خیمۂ آسماں کے تلے رہ کے بھی
چاند سورج کے کب مٹ سکے فاصلے
اس قدر فاصلے بھی مٹے ہیں کبھی

5

ان گنت فاصلے، ان گنت فاصلے
تیری تقدیر ہیں میری تقدیر ہیں
اور تقدیر کیا ہے یہی بے بسی
جو نہ تم سے نہ مجھ سے مٹی
جو کسی اور صورت بھی مٹتی نہیں
ہاں مگر یہ کہ لمحات زر میں ڈھلیں
یا کوئی زر کے رتھ زر کے رہوار آنے جانے لگیں
یا اگر انقلابِ جہاں تاب میں ڈھل سکیں
تو یہی بے بسی اپنا منہ پیٹ کر
اپنی ہی آگ کی راکھ ہو جائے گی
اور نادیدہ صحراؤں کی بے کراں وسعتوں میں بکھر جائے گی
بے بسی
جس سے بزم جوانی سجائی گئی
بے بسی
جس کے آگے کوئی دن بھی ہو رات ہے

رات کا کیا ہے، رات آ گئی اور گئی

اور شب بھر کا جاگا ہوا چاند رخصت ہوا

صبح ہوتی رہی شام ہوتی رہی

کوئی مژدہ نہ پیغام۔ کچھ بھی نہیں

لمحے مرتے رہے

پتے گرتے رہے

اشک امنڈتے رہے

جیسے اپنے ہی ماتم میں گریاں کوئی

زندہ مردے کے ماتم میں روئے کوئی

میتِ محض کو غم تو ہوتا نہیں

مردہ بارِ مسرت تو ڈھوتا نہیں

جب حواس اور احساس کے سارے ہی قافلے جا چکیں

پھر محالات امکان کے دائرے میں تو آتے نہیں

ہاں یہ امکاں فقط زندہ مردہ میں ہیں

یوں ہی میں اپنے ماتم میں روتا رہا

زندگی

اور میں

لمحے لمحے میں ڈھلتے رہے

اور مرتے رہے

پتے گرتے رہے

اشک امنڈتے رہے

پتے پتے کے ماتم میں روتا رہا

زندہ ہوتے ہوئے

اپنے ماتم میں روتا رہا

روتے روتے ہی یہ فصلِ سرما گئی

پھر بہار آ گئی سبزہ و گل لیے

قہقہے، چہچہے، زمزمے جاگ اٹھے

پنچھیوں کے ترانے ابھرنے لگے

نیلگوں آسماں بادلوں سے بھرا

اور بھرتا رہا

موتیوں سی پھواریں برستی رہیں

اور جل تھل زمیں

کچی چاندی کی چادر سی بنتی رہی

کچی چاندی کے گھنگھرو سے بجتے رہے

اور بکھرتے رہے

آسماں پر افق تا افق

کتنے ہی رنگ جادو جگاتے رہے

ابر پاروں کی ٹھنڈی حسیں چھاؤں میں

طائر اڑتے رہے

گیت، خوشبو، حسیں رنگ ہر سو بکھرتے رہے

لیکن اس فصل میں بھی

کونپلوں، مہکی پھلواریوں

اور سرسبز پیڑوں کے ہی درمیاں

اک نہ اک پیڑ، گم گشتہ پتوں کا نوحہ سناتا رہا

جس کی ایک ایک شاخ

ایک ادنیٰ سی موجِ ہوا سے لرزتی رہی
چند ایک خشک پتوں کو تھامے ہوئے
لمحے لمحے جو دامن چھڑاتے رہے
لے اڑی جن کو موجِ ہوا
اور پیڑ اس خجالت میں
عریانیت میں سسکتا رہا
سسکیاں
اس کی شاخوں میں تھیں
یا ہوا میں تھیں
کس کو خبر
میں تو روتا رہا
شام ہوتی رہی
صبح ہوتی رہی
وقت اڑتا رہا
اور پیغام! کوئی نہیں

کچھ نہیں!!

بیتے لمحوں کی یادیں بھی دھندلا گئیں
اڑتے پتوں کے منظر بھی گم ہو گئے
پتھروں پر کہیں سر دھرے سو گئے
اور اب
جب کہ گرمی کے سورج میں تابش بھی ہے
صبح کے وقت کی کیف پرور
سنہری چمکتی ہوئی دھوپ میں
فصل کاٹی کوئی اور نہ بوئی کوئی
اور شفق تو فقط رنگ ہی رنگ ہے
رنگ امید کے خون کا۔ پھول کا
لیکن اک مژدۂ انقلاب آفریں
پھول میں بھی شفق میں بھی پوشیدہ ہے
سارے ہی موسموں میں وہی رنگ ہے

عظیم شفقت

(1) زمین پر جا بہ جا پہاڑوں کے سلسلے ہیں

جو اپنے دامن میں سبزہ وگل

اور اپنی تہہ میں کروڑوں الماس ولعل رکھ کر

طویل سایوں کے فرش کھولے ہوئے کھڑے ہیں

گھنے درخت اپنے سبز پتوں، حسیں شگوفوں سے خیمۂ سایہ دار بن کر

لچکتی شاخوں کی مورچھل لے کے

حدتِ آفتاب کے سامنے سپر ہیں

زمین بھی سینہ کھولتی ہے

ہر ایک دانے کو اپنے دل میں

بٹھا کے پودا، درخت پھل پھول کے منازل بھی بخشتی ہے

اور آسماں کی بلندیوں کی سمیٹنے کی بلندیاں بھی

نمو کے اندازِ بیکراں میں ابھارتی ہے

(2) ہر ایک جھیل اور ہر ایک دریا
ہر آبشار اور ہر اک سمندر
یہی ترانہ سنا رہا ہے
کہ کوئی پیاسا نہ رہنے پائے
کہ تشنگی کا شکنجۂ بے اماں کسی کو نہ کسنے پائے

(3) عظیم فطرت کی شفقتوں میں
ہر اک کا حصہ مساویانہ
کروڑوں سالوں، کروڑوں فصلیں
اُگیں مگر آدمی ہے اب تک
خود آدمی ہی کی چیرہ دستی و غصب کوشی کا ہی نشانہ

(۴) ہماری انسانیت یہی ہے
کہ ہم اسی شفقتِ معظم
اسی محبت، اسی صداقت کو سو بہ سو کو بہ کو لٹائیں

دخترانِ چین

پو پھٹے کا حسن ہیں یا صبح کی پہلی کرن
رائفل شانوں سے لٹکائے ہوئے نازک بدن
تابناکی اور شجاعت کی مثالی صورتیں،
دخترانِ چین ہیں کیسی مثالی صورتیں
مشق کا میدان ہو یا جنگ کا میدان ہو
کیوں نہ نصب العین پر ان کی نظر ہر آن ہو
جذبِ گیسو و کمر ان کی نظر میں ہیچ ہے
اطلس و دیبا نگاہِ معتبر میں ہیچ ہے۔
کوہ و صحرا ان کے قدموں سے شرف سامان ہیں
کاملیت کے یہ پیکر ہیں، عمل کی جان ہیں
عشق ان کو فرض سے اور انسیت وردی سے ہے
صنفِ نازک ہو کے بھی کام ان کو جواں مردی سے ہے۔

خواب

رکھ زندہ اسے ہو جو کوئی خواب توانا

آخر یہ کوئی سنگ و گل و خاک نہیں ہے

افلاک کے نیچے تہہ خورشیدِ جہاں تاب

☆☆☆

خوش رنگ ہو جو سایۂ پر کربِ فنا میں

یا نیند نے تابندہ و مرغوب کیا ہو

یا ابرِ بہاراں نے بنا ڈالی ہو جس کی

تابش گہر اندازیِ باراں نے بھی دی ہو

ابھرا ہو جوانی کی طرب خیز افق سے

مستی کسی معصوم خراماں نے بھی دی ہو

یا ابھرا ہو پیری کی الم ناک فضا میں

جب رس ہو نہ مس ہو نہ کسی شوخ کی چھب ہو

ہو عمر کے موسم میں شبِ موسمِ سرما
ہر رنگ نئے کرب، نئے غم کا سبب ہو
اس وقت یہی دولتِ بیدار دل و ذہن
بس ایک یہی خواب بنا ہے گا ترا ساتھ
جو دورِ گذشتہ میں تباہی کہ خوشی ہو
ہر عہد میں گل ریز رہا اور رہا ساتھ
رکھ یادِ گل و سنگ بھی سو جائیں گے گل خیز
یہ خوابِ بہاراں جو ترے ساتھ رہے گا
یہ خواب رہا ساتھ اگر تا دمِ آخر
بخشے گا تجھے دولتِ بیدار مسرت
اور ذہن کی وسعت کو طرب خیز ادا بھی
پھولوں کی، شگوفوں کی طراوت بھی، مہک بھی
فواروں کی آوازیں بھی، پنچھی کی چہک بھی
ہاں صرف ترے خواب کو حاصل ہے یہ توفیق
وہ جو ترے ذہن اور دلِ مضطر کی ہے ایجاد

جو کرب کے موسم کو طرب خیز بنا دے

اور کر دے خرابے کو بھی بارونق و آباد

جو تیرے نفس ہی سے ہو تابندہ و زندہ

تابندہ و پائندہ و پُرتاب و جہندہ

(ڈبلو۔ ایچ۔ اوڈن کی نظم کا ترجمہ)

کنارِ دریا

آج پھر تنہائی دل کھینچ لائی ہے یہاں

آبِ دریا کی تموج خیزیوں کو دیکھنے

جس میں عکسِ مہرِ تاباں بھی ہے عکسِ ابر بھی

جس طرح سے روح میں ہے اضطراب و صبر بھی

جس میں پہلی سی ہے جولانی نہ طوفانوں کی خو

جس میں اک مدت سے مدھم سا ہے بحرِ آرزو

دونوں جانب کشت ہیں کشتوں میں شادابی کا دور

جن میں ہے جوشِ نمو اور رقصِ سرمستی کے طور

اور پنگھٹ پر سحر افزا حسیناؤں کا زور

مرغِ ماہی، خوار و مرغابی و سرخاب اور چپے

کچھ کھڑے کچھ تیرتے کچھ جابجا اڑتے ہوئے

جن کو کچھ تاشی شکاری ہیں نشانے پر لیے

کچھ مچھیرے دام پھیلا کر ہیں بے آوازلب
جیسے دریا کے جلو ہوں پھیلتے دستِ طلب
ان کو کیا پروا کہ دن ہو ختم اور آ جائے شب
ہر کوئی کوشاں ہے اپنی کامیابی کے لیے
چاہے کوئی کچھ کہے یا چاہے چپ سادھے رہے
خواہ تھم جائے یہ دریا یا روانی سے بہے
دل یہ ماہی خوار و ماہی ہے نہ مرغابی یہاں
کس لیے کرتے ہیں اس پر مشقِ صیادی یہاں
سینکڑوں تاشی شکاری ساحلِ دریا کے پاس

حسنِ کامل

ترا روپ کم سن حسیناؤں سے کچھ سوا ہے
کہ ان میں نہ تیرے بدن کا سا رس ہے
نہ ہے وہ نزاکت نہ حسن و ادا ہے
مجھے کچی کلیوں کی جلوہ گری سے نہ مطلب نہ شیدا ہوں ان کونپلوں کا
جو رنگوں کے جادو جگاتی ہیں لیکن ہے رس جن میں کوئی نہ خوشبو ہے کوئی
مجھے ایسے گل سے محبت ہے جو سارے گلشن میں یکتا ہے اپنی پھبن کا
وہ جس کو گذرتی ہوئی دھوپ چھاؤں کمالاتِ حسن و اثر بخشتی ہو
ابھرتی ہوئی وقت کی رو جسے پیار پہچاننے کی نظر بخشتی ہو
جو ہو اور پھولوں میں یکتا چمن میں
کہ [illegible] یکتا وفا کے چلن میں
ترا روپ ذ ل سا کیا تو کیا ہے کہ کونپل کا ڈھلنا ثمر کے لیے ہے
مگر کر کے ناپختگی کا بہانہ کسی اور کی گود میں گر نہ جانا
کہ تو کچی کلیوں سے اور کونپلوں سے جدا ہے
ترا حسن بھی کچھ سوا ہے

دیوانے کی بڑ

آدمی لاکھوں میں تھے جب تو خدا تھے سینکڑوں
سہل تھا ان کے لیے رکھیں بشر کو سرنگوں
اختیارات خدائی بانٹ کر رہتے تھے وہ
آدمی تھے لیکن ان کے واسطے صید زبوں
گلشن دوشیزگی کے پھول چنتے تھے بہ جبر
مکر بھی کرتے تھے بہ ریاؤں سے مخلوق سے
ابر کی صورت میں، گاونر کی صورت میں کبھی
لے کے اڑ جاتے حسیناؤں کو بن دیکھے ہوئے
مانگتے تھے بھینٹ دوشیزاؤں کے تازہ خون کی
کیونکہ لازم تھا بشر سے لیں خدائی کا خراج
عام بھی اور خاص بھی شہزادیاں شہزادے بھی
دیتے تھے نقدِ جوانی کی بھی صورت میں باج

یہ خدا باہم بھی تھے محوِ مصاف و گیر و دار
آدمی کی طرح رہتے تھے کدورت کوش بھی
گرچہ یہ کچھ رزم آرا ہی رہتے تھے مدام
اور بپا کرتے تھے اپنی بزمِ ناؤ نوش بھی
یہ تصور خود بشر کا تھا خداؤں کا نہ تھا
کیونکہ کوئی بھی وجود ان دیوتاؤں کا نہ تھا
پھر خدا گھٹنے لگے یعنی کہ یہ نوعِ بشر
ارتقائے فکر کی منزل کی رہ پیما ہوئی
اور شعورِ کائنات و ذات و اندازِ حیات
بڑھ گیا اور روح میں بالیدگی پیدا ہوئی
ذاتِ واحد کے تصور تک پہنچ کر کوئی دیر
کاروانِ ارتقائے فکر آسودہ ہوا
کچھ یہیں پر رک گئے اور چند آگے بڑھ گئے
کچھ کو احساسِ تلاش و سعیِ بیہودہ ہوا
بن گئے پھر ان خداؤں کی جگہ ایسے خدا

جو ہیں انسانوں کی صورت ہی میں انساں کے عدو

جولہو تک بےکسوں کا چوس لیتے ہیں مگر

کہتے ہیں آؤ کہ ہم رکھتے ہیں رزّاقی کی خو

لیکن ان لاکھوں خدایانِ زمیں کا مکر و ظلم

فاش ہے نوعِ بشر پر اور بشر ہشیار ہے

یہ خدا باہم مقابل ہیں بشر کے ساتھ بھی

اور بشر ان سے مسلسل برسرِ پیکار ہے

ہوا چل رہی ہے

ہوا چل رہی ہے

شگوفے ہیں رقصاں ہوا چل رہی ہے

ہر اک سمت پھلواریاں جھومتی ہیں

پَر افشاں ہے جن سے کچھ ایسی ہی خوشبو

جو میری نظر میں سمائی ہوئی ہے

شگوفے ہیں رقصاں ہوا چل رہی ہے

درختوں کے پتوں کی ہر سرسراہٹ طلسمات کی موج میں ڈھل رہی ہے

ہے جیسے رگ و پے میں وہ سنسناہٹ کہ جیسے وہی گل بدن چل رہی ہے

جو میرے خیالوں میں چھائی ہوئی ہے

ہوا چل رہی ہے

بگولے ہیں رقصاں ہوا چل رہی ہے

کہ جیسے وہ طرّارے بھرتی غزالہ خود اپنے ہی افسوں سے رقصاں ہوئی ہے

سماعت میں جس کے لباسِ حریری کی سی سرسراہٹ ترنم فشاں ہے

جو جادو جگانے پہ آئی ہوئی ہے

ہوا چل رہی ہے

اڑے جا رہے ہیں کچھ اس طرح بادل کہ جیسے کسی نے بکھیرا ہوا آنچل

جو میرے تصور پہ چھائی ہوئی ہے

جہاں اس کی رفتار ہی کا ہے جادو کہ جس سے

ہزاروں دیے سے ہیں روشن

جو موجِ طلسمات میں ڈھل رہی ہے

اندھا سفر

ذہن کے دیوار و در پر سوچ کی یلغار ہے
سر کسی انجن، کسی موٹر کسی دیوار سے
'پاش ہو جائے تو پھر یہ سوچ کا دھارا رکے
جس سے روز و شب نہیں ملتی کوئی راہِ نجات
شاخِ گل سے پھول رخصت ہو تو جاتی ہے مہک
مل گیا مٹی میں تو رنگِ فسوں مٹ جائے گا
ایک لمحے کے لیے موجِ سبو رک جائے گی
پھر کسی اندھے سفر کی رہنما ہو جائے گی
لیکن اندیشہ یہی ہے یوں مٹا یہ پھول اگر
کر گئی یوں ہی مہک ان دیکھی منزل کا سفر
عمر بھر تکتی رہو گی آسمانوں کی طرف
اور حیاتِ جاوداں کے قصہ خوانوں کی طرف

نافرستادہ جواب

تیری آنکھوں سے آنسو تھے اس دن رواں
میری آنکھیں بھی اشکوں کی تھیں ندیاں
اور کہا دامِ غم سے رہا ہو گئے
میں نے سوچا کہ میں آج آزاد ہوں
تم نے سوچا کہ میں آج سے شاد ہوں
یہ نہ سوچا کہ ہم کیا سے کیا ہو گئے
سخت لو اور کڑکتی ہوئی دھوپ میں
جیسے ہم ڈھل گئے تھے نئے روپ میں
اک نئے راستے پر جدا ہو گئے
اک زمانہ جو گذرا خوشی کی طرح
آج کیوں سوچتی ہو غمی کی طرح
اپنی اپنی انا میں فنا ہو گئے
موت کے بعد اگر ہے کوئی زندگی
وصل بن جائے گی فرقتِ دائمی
ورنہ پتے تھے نذرِ ہوا ہو گئے

بے وفا کی وفا

میں ہوں شاعر پرستارِ حسن و جمال

کالے گورے کی تخصیص اس میں نہیں

حسن جس رنگ میں بھی ملے حسن ہے

ہو جو وجدان، تلبیس اس میں نہیں

اور تصور تو خود حسن سے ہے ہوا

جوزی فائن وکیتھرائن اور تھریسیا

اور پیرس کی محبوبۂ جاں فزا

میری بزمِ تخیل میں حاضر ہیں سب

نیل کی ساحرہ، جلوہ بارسبا

اس تصور کے رنگیں عناصر ہیں سب

لذّت افزائی بے سبب تو نہیں

رام ہے سامنے اور کنھیا بھی ہے

میرا آدرش ہے پیار انسان کا

اور انسان کا نصف بہتر ہے کون؟

زندہ تصویرِ حسن و لطافت ہے یہ

مجھ کو انساں سے تھا پیار ممکن نہ تھا

اور ہو بھی تو بس اک کی تخصیص ہو

وہ جو جوئے میں ہاری گئی تھی وہ بھی

ہارنے والے بھی جیتنے والے بھی

کوروں پانڈووں میں لڑائی ہوئی

پاپ انیائے اور یدھ دھرم ہے تو پھر

کس لیے سکھ کی بنسی بجاتا رہا

کنیایوں کو لے سے بلاتا رہا

بے بصر رمز پانے سے قاصر ہیں سب

جس کی سب گوپیوں سے مجھے پیار ہے

جس سے روشن مری بزمِ افکار ہے

صنفِ نازک جو ہے خوبصورت تریں

یہ وہ نکتہ ہے میں جس سے بھٹکا نہیں

صنف، نازک پہ دل میرا مائل نہ ہو

دوسری کی اداؤں سے گھائل نہ ہو

مجھ کو پیاری ہے اور ہیں جو اری رقیب

ذہن میں ہیں وہ غیرت سے عاری رقیب

تو کشن اس میں کیوں بن گیا تھا فریق

اس سے پہلے نہ کیوں کی یہ فکرِ عمیق

اور جمنا کے تٹ جاتا آتا رہا

گیت گاتا رہا من لبھاتا رہا

راگ رس رشو سے کتنے ہی منسوب ہوں

اس میں حائل اگر ہوں قصور و محل

ہاں میں تخریب کا دیو خود سر نہیں

جبل ہوں ماروافعی نہ ماہی ہوں میں

میں نہ اوتار ہوں اور نہ اوتار گر

جو گرا دے مجھے آدمیت سے بھی

مجھ کو سیرابیاں بانٹنے کی ہوس

بے نیازانہ نغمات گاتا ہوں میں

ہے وفا مجھ میں بھی اک وفادار کی

ایک کی اک بدن سے ہے وابستگی

کیا جو وابستہ اجسام ہی سے نہیں

ہے مرا پیار بھی شیام ہی کی طرح

ہاں جو اودمان کہتا ہے اس کو کہے

اس محبت میں کچھ تنگ ظرفی نہیں

مجھ کو پاروسے، شکتی سے بھی پریم ہے

گو نمائش سے بچنا ہے میری سرشت

ہے جداگانہ میرا شرنگار رس

کچھ وہی مصرفِ لطفِ دیدار تھا

وہ بھی انسان تھا میں بھی انسان ہوں

میں تو اک پرش ہوں ایک دودوان ہوں

میں تو اک آدمی ہوں محبت بھرا

ہر چمن میں، میں چلتا ہوں مثلِ صبا
شو سے وشنو سے بھی ہے رقابت مری
ہے شرارت سے خالی شرافت مری
میرا اک راگ ہے پیار انسان کا
نام مٹ جائے ہر قصر و ایوان کا
کوہ پیکر نہیں خالقِ شر نہیں
آدمی ہوں میں کچھ اس سے کمتر نہیں
تجربہ مجھ کو حیوانیت کا ہو کیوں
ایسا دعویٰ ہی رہبانیت کا ہو کیوں
ایک خاموش دریا ہوں بہتا ہوا
خشکی و دشت و صحرا کو سہتا ہوا
ایک محدود ہے دوسرا بیکراں
دوسرا ایک دریا تموج فشاں
یعنی شاعر پرستارِ حسن و جمال

نگارِ صبح

وہ بامِ افق سے سحر جھانکتی ہے
جہاں سے ابھرتی ہوئی سرمئی روشنی ہر طرف پَر فشاں ہو رہی ہے
اندھیروں کی نبضیں ہیں ٹوٹی ہوئی سانس گم ہے جنازہ چلا ہے
جنھیں چند تارے لئے جا رہے ہیں
جو دشتِ زمرّد میں اب بھی ہیں روشن
جو اپنی لرزتی ہوئی روشنی کی زباں سے مسلسل یہی کہہ رہے ہیں
وہ بامِ افق سے سحر جھانکتی ہے
گھنے شاخساروں میں جاگے ہیں پنچھی
ترنم کا سیلاب سا بہہ رہا ہے
نئی صبح کے چھڑ گئے ہیں ترانے
مدھر تان میں ایک اک طائرِ خوشنوا چہچہا کر رہا ہے
وہ بامِ افق سے سحر جھانکتی ہے

صبا چل رہی ہے
ہر اک سمت کلیوں نے کھولی ہیں آنکھیں
جو ہیں منتظران رو پہلی شعاؤں کی جو پرفشاں ہوں گی سطحِ زمیں پر
جو خاموش پیغام میں کہہ رہی ہیں
کہ کچھ دیر میں اب ہے وہ آنے والا
وہ جس سے زمانے میں ہوگا اجالا
جو تابش فزا ہوگا تاب آفریں بھی
وہ جس کے نفس سے فلک پر، زمیں پر
ستاروں میں، سۂ .رں میں زندگی ہے
وہ دیکھو افق سے سحر جھانکتی ہے
یہ مانا کہ یہ ساعتِ معتبر ہے جو خاموش آواز میں کہہ رہی ہے
وہ بامِ افق سے سحر جھانکتی ہے
نظر دیکھتی ہے
سماعت میں آوازیں بھی گونجتی ہیں
یقیں بھی ہے لیکن

گئی شب کے پیہم فشارِ ممات آفریں نے

جو بے جان و بے حس کیا ہے

نئی نیم جانی یہی ہے جو اندیشہ بن کر ابھرتی ہے دل میں

کہ جب تک وہ جلوہ نمائی کرے گا

دل و جسم کا ربط باقی بھی ہوگا؟

کہ اپنا بھی عالمِ جاں کنی ہے

وہ بامِ افق سے سحر جھانکتی ہے

تارِ نفس

کتنا حیرت فزا ہے یہ باغِ جہاں
زندہ تصویر گم ہوگئی خاک میں
دل کی گہرائیوں میں سنبھالیں گے ہم
جس کا پرتو ہے اک چشمِ نمناک میں
کل تلک ایک زندہ حقیقت تھا جو
آج خوابوں کی دنیا کا باشندہ ہے
کیا ہے انسان کی انفرادی حیات
چند سانسوں کی ناپائیداری کا نام
دو جہانوں کا خالق اگر ہے کوئی
جانے اس نے بنایا ہے کیسا نظام
ایک ایک کر کے پیاروں کو رخصت کریں
پھر اچانک کسی روز خود بھی چلیں
اپنے آنے سے لے کر بچھڑنے تلک
اشکِ غم ہی کے موتی بہایا کریں
ہو کے رخصت رہا کتنا بے تاب میں
جس کا پرتو ہے اب چشمِ پُر آب میں
جیسے اپنا ہی ٹوٹا ہے تارِ نفس
نغمۂ درد ہے تار اعصاب میں

نجومی سے

مری تقدیر میں کیا ہے
یہ مانا تو بتا دے گا
مگر تقدیر خود کیا ہے، کبھی تو نے یہ سوچا ہے؟
ترا اپنا ہے کیا انجام، اور آغاز کیوں کر تھا
ترے بچپن کے وہ ساتھی، جو تجھ سے اتنے آگے ہیں
کہ ان کی گردِ پا تک کہکشاں ہے تیری نظروں میں
جو محلوں کارخانوں کوٹھیوں
کے جال بن کر آج تجھ سے ناشناسا ہیں
اس انسانوں کے جنگل میں کبھی سوچا ہے وہ کیا ہیں
وہ ان کے آسماں بوس آستانے
کون سے افسوں سے بنتے ہیں
لکیریں دیکھتے ہو ہاتھ کی، وہ ہاتھ بھی دیکھے؟
جو پراسرار دیواروں کے پیچھے حدِ فاصل کے نگہباں ہیں
وہ حد جو آدمی اور آدمی کے درمیاں
ناقابلِ تسخیر بنتی ہے، خطِ تقدیر بنتی ہے

روحِ عصر

اگر تم ایک دشتِ بیکراں ہو
جس کا ہر ذرہ جہانِ تشنگی ہو تو بھی کیا غم ہے
میں دریا بن کے ہر ذرّے کو سیرابی سے اک گلشن بنا دوں گا
ببولوں کو مہک ذروں کو تابش کا متاعِ بے بہا دوں گا
نشانِ راہ ہوں منزل ہوں جادہ ہوں
وفا کا جان دادہ ہوں
میں سیلِ بیکراں بھی ہوں
تری شادابیوں کا اک نشانِ جاوداں بھی ہوں
کہ میں انسانیت کے لشکرِ فتح و ظفر کا اک پیادہ ہوں
میں روحِ عصر ہوں
میں وقت کی آواز ہوں
نا قابلِ تسخیر انساں ہوں

شکستِ فاش

کالے بت سب سرنگوں ہیں
اور کاہن دم بخود
رات کے جنگل میں چیخیں گریہ آسا بھی نہیں
آندھیاں اٹھی ہیں ہر جانب مسلسل گونج ہے
لاکھوں ہاتھ اٹھے ہیں
مقتل زد میں ہیں
خلا دتھرائے ہوئے
آسماں سے کوئی دیوی دیوتا آیا نہیں
اور زمیں کے دیوتاؤں کو شکستِ فاش ہے

بولتی ہوئی آنکھیں

ہرنیوں کی مست آنکھیں
بولتی ہوئی آنکھیں
بولتی ہیں کیا کیا کچھ
پھر بھی میں نہیں سنتا
پھر بھی کچھ نہیں کہتا
بولتی ہوئی آنکھیں
کہہ رہی ہیں کیا کیا کچھ
جسم کا اٹل رشتہ
جسم کی اٹل آواز
جسم و جان کا رشتہ
خواہشات کی پرواز
ڈھلتی ہے نگاہوں میں

بولتی ہیں کچھ آنکھیں
بولتی ہیں کیا کیا کچھ
پھر بھی میں نہیں سنتا
پھر بھی کچھ نہیں کہتا
کتنی سخت زنجیریں
کتنی سخت دیواریں
ٹوٹ کر بکھرتی ہیں
ذہن ہے حصاروں سے
چھن کے ان کی آوازیں
مست مست آنکھوں سے
جھانکتی ہیں ہر جانب
بولتی ہیں پھر آنکھیں
اور میں نہیں سنتا
سوچتا ہوں، پھر بولوں
بند کھڑکیاں کھولوں

اور پروں کو پھر تولوں

کیوں نہ زہرِ ظلمت میں

ایک کیمیا گھولوں

ایک ایک ہرنی ہو

آرزوؤں کی زد میں

آرزوئیں پوری ہوں

عشرتوں کی سرحد میں

اور جب گروں تھک کر

قبر ہی کی نیند آئے

بولتی ہیں کچھ آنکھیں
بولتی ہیں کیا کیا کچھ
پھر بھی میں نہیں سنتا
پھر بھی کچھ نہیں کہتا
کتنی سخت زنجیریں
کتنی سخت دیواریں
ٹوٹ کر بکھرتی ہیں
ذہن ہے حصاروں سے
چھن کے ان کی آوازیں
مست مست آنکھوں سے
جھانکتی ہیں ہر جانب
بولتی ہیں پھر آنکھیں
اور میں نہیں سنتا
سوچتا ہوں، پھر بولوں
بند کھڑکیاں کھولوں

اور پروں کو پھر تولوں

کیوں نہ زہر ظلمت میں

ایک کیمیا گھولوں

ایک ایک ہرنی ہو

آرزوؤں کی زد میں

آرزوئیں پوری ہوں

عشرتوں کی سرحد میں

اور جب گروں تھک کر

قبر ہی کی نیند آئے

ایک پہیلی

ایک نازک سی رقص آفریں نازنیں
تازیانوں کو چیلنج کرنے لگی
قہر کے بیڑے حرکت میں آنے لگے
بادبانوں کو چیلنج کرنے لگی
گونج اٹھے بحر و بر زلزلے آگئے
قصرِ آبی میں خشکی کے ایوان میں
مسندِ اختیارات ہلنے لگی
تھرتھری سی مچی آن میں شان میں
ناخداؤں میں سرگوشیاں چل پڑیں
کس قدر زور اک جانِ نازک میں ہے
آتشِ سیل میدانِ نازک میں ہے

ایک فصلِ خزاں

خس سے بھرپور ہواؤں کے تھپیڑے بے رحم
اہلِ ثروت کی طرح فصلِ خزاں کا انداز
کھڑکھڑاہٹ ہے بکھرتے ہوئے پتوں کی مہیب
جیسے چھڑوں کے ہوں نغمات تو بندوق کے ساز
قابلِ دید ہے بے مہریِ یارانِ چمن
اب شگوفے ہیں نہ کلیاں ہیں نہ ہریالی ہے
زنگ در زنگ جہاں گلبن و گل مہکے تھے
خار ہیں یا خس و خاشاک کی اک جالی ہے
میں ہوں بے شاخِ نشیمن تو چمن ہے ویراں
نہ وہ پنچھی نہ فضائیں ہیں گل افشانی کی
پیڑ آئینے ہیں اب بے سروسامانی کے
شاخیں تصویر نظر آتی ہیں حیرانی کی
دردِ حرماں کا مداوا تو ضروری ہوگا
پلٹ آئیں گی وہ گلپوش بہاریں آخر
درد کی لے میں سہی نغمۂ امید اپنا
کیوں نہ اس حسنِ گلستاں کو پکاریں آخر
ہم جو نغماتِ جنوں خیز میں ڈھل جائیں گے
ان گنت بار یہاں موسمِ گل آئیں گے

ایک موسمِ سرما

موسمِ سرما کی باغ وراغ میں یلغار ہے
برف سے بڑھ کر خنک موج ہوا چلتی ہوئی
اور پلٹ کر زخم کے سے درد میں ڈھلتی ہوئی
سبزہ کی ایک ایک پتی جاں بلب گلتی ہوئی
موسمِ سرما کی باغ وراغ میں یلغار ہے
آدمی سکڑے ہوئے ہیں کوچۂ دبازار میں
اہلِ زر اڈے ہوئے ہیں جلوہ گاہِ یار میں
رقص خانوں میں ہیں یا ہیں ہوٹلوں کے بار میں
جل رہی ہے آتشِ حسرت دلِ نادار میں
موسمِ سرما کی باغ وراغ میں یلغار ہے
اہلِ دولت کے یہاں جلتے ہیں ہیٹر یا کریٹ
دائروں، قوسوں میں بیٹھے وقفِ نادنوش ہیں
موسمِ گرما کی یادوں میں مگر کھوئے ہوئے

بے نوایانِ تہی جیب و تہی آغوش ہیں

موسمِ سرما کی باغ وراغ میں یلغار ہے

یہ بزعمِ خویش سب عالی نسب عالی مقام

بھوک کی تیزی کے موسم میں شکم پرور بھی ہیں

ان کی میزوں پر چکن بھی ،ہمپ بھی بیکن بھی ہے

اپنے ہی حق میں یہ منعم بھی کرم پرور بھی ہیں

موسمِ سرما کی باغ وراغ میں یلغار ہے

سج رہے ہیں کس قدر پشمینۂ افرنگ میں

قوسِ تن جن کے نمایاں ہیں لباسِ تنگ میں

دلکشی ایسی کہاں ہوگی کسی ارژنگ میں

ہے کہاں یہ جاذبیت نقشِ رنگ وسنگ میں

موسمِ سرما کی باغ وراغ میں یلغار ہے

زر کے بندوں کے گھروں میں ہیں ایئر کنڈیشنر

پھینکتے ہیں گرم رومال خیز امواج ہوا

تیز دھن کے کرتے ہیں ریکارڈو ہسکی کا اثر

ایک موسمِ سرما

موسمِ سرما کی باغ وراغ میں یلغار ہے
برف سے بڑھ کر خنک موج ہوا چلتی ہوئی
اور پلٹ کر زخم کے سے درد میں ڈھلتی ہوئی
سبزہ کی ایک ایک پتی جاں بلب گلتی ہوئی
موسمِ سرما کی باغ وراغ میں یلغار ہے
آدمی سکڑے ہوئے ہیں کوچۂ و بازار میں
اہلِ زر اَنڈے ہوئے ہیں جلوہ گاہِ یار میں
رقص خانوں میں ہیں یا ہیں ہوٹلوں کے بار میں
جل رہی ہے آتشِ حسرت دلِ نادار میں
موسمِ سرما کی باغ وراغ میں یلغار ہے
اہلِ دولت کے یہاں جلتے ہیں ہیٹر یا کریٹ
دائروں، قوسوں میں بیٹھے وقفِ نادنوش ہیں
موسمِ گرما کی یادوں میں مگر کھوئے ہوئے

بے نوایانِ تہی جیب و تہی آغوش ہیں

موسمِ سرما کی باغ وراغ میں یلغار ہے

یہ بزعمِ خویش سب عالی نسب عالی مقام

بھوک کی تیزی کے موسم میں شکم پرور بھی ہیں

ان کی میزوں پر چکن بھی، ہمپ بھی بیکن بھی ہے

اپنے ہی حق میں یہ منعم بھی کرم پرور بھی ہیں

موسمِ سرما کی باغ وراغ میں یلغار ہے

سج رہے ہیں کس قدر پشمینۂ افرنگ میں

قوسِ تن جن کے نمایاں ہیں لباسِ تنگ میں

دلکشی ایسی کہاں ہوگی کسی ارژنگ میں

ہے کہاں یہ جاذبیت نقشِ رنگ و سنگ میں

موسمِ سرما کی باغ وراغ میں یلغار ہے

زر کے بندوں کے گھروں میں ہیں ائیر کنڈیشنر

پھینکتے ہیں گرم روماں خیز امواج ہوا

تیز دھن کے کرتے ہیں ریکارڈ وہسکی کا اثر

اور کیفِ مے کو ہے مہمیز امواج ہوا

موسمِ سرما کی ہے یلغار باغ وراغ میں

دل میں احساسات پر یخ بستگی کا ہے سماں

ذہن میں افکار کی لو منجمد ہوتی ہوئی

گونجتی ہے ذہن میں لیکن ہر اک موجِ خیال

انقلابِ رنگِ گلشن پر بضد ہوتی ہوئی

موسمِ سرما کی ہے یلغار باغ وراغ میں

ایک دن فصلِ بہار آئے گی باغ وراغ میں

عالی واعلیٰ ستم گر جب نہ ہوں گے باغ میں

شہر وکوہ ودشت میں جب زندگی لہرائے گی

داغ جب ہوں گے نہ شعلے ہوں گے دل کے داغ میں

موسمِ سرما کی باغ وراغ میں یلغار ہے

راستہ

چلا ہوں سمتِ نشیمن کہ آدھی رات گئی
تصورات میں ہے مہر و ماہ کی تصویر
کوئی تو رنگ بھروں خوابِ عیشِ فردا میں
ہو خوشگوار سی کچھ حوصلہ شکن تعبیر
اور اپنے ذہن میں کرتا چلوں حسیں تفسیر
طویل راستہ آخر کسی طرح تو کٹے
خیالِ حال تو کرتا ہے ہر قدم پہ نڈھال
نہ اضطرابِ فراق اور نہ یادِ لطفِ وصال
کوئی نہیں ہے جسے انتظار ہو میرا
کوئی نہیں ہے کروں جس کو زینتِ آغوش
طویل عرصے سے یکساں ہے اپنی حالتِ دوش
تھکی ہوئی سی ہیں کرنیں، تھکا ہوا سا غبار
کہ جیسے درد کا ہر ذرہ سہہ رہا ہو فشار

درخت جھولتے ہیں پتے سرسراتے ہیں
اور ان کی چھاؤں کا محزوں فسوں ہے یوں جیسے
کسی حسینہ کی پلکوں کے مضطرب سائے
یہ راستہ جونیشن کی سمت جاتا ہے
ہے مفلسوں کے دلوں کی طرح اجاڑ بہت
قدم قدم پہ ہے ریت اور سنگ و خار بہت
اب ایسی راہ بجز جبر کس کو ہو مقبول
طبیعت اپنی کروں تو کروں کدھر مبذول
اسی ہی شہر میں کتنے ہی راستے ہیں جہاں
بھرے ہوئے ہیں مہکتے سنہرے رقص کدے
صدائے ساز ہم آہنگِ گرمیٔ اجسام
قدم قدم سے ہے سینے سے سینہ وقفِ کلام
نظر سے بیٹھے ہوؤں کی طرف بھی لطف پیام
ہر ایک پول (Pole) ہر اک تار ارتعاش میں ہے
صدائیں دوڑ رہی ہیں عجیب ہلچل ہے

زنازن اور دنادن، دنادن، دن ددن

جو کر رہے ہیں وصول ان پہ فاش ہے مفہوم

مرے تو دل میں سمائی ہے خواہشِ مشروم

نہیں ہے قرب کی خواہش سنہرے پتوں سے

نہ کوئی وجہِ حسد عیش و زر پرستوں سے

مگر یہ راہ بہ ہر طور کاٹنی ہے مجھے

کہ اب تو بس یہی انعامِ زندگی ہے مجھے

جو مجھ میں سنسنیاں ہیں خنک ہوائیں ہیں

دلِ زمیں میں ہیں اور سینۂ فضا میں ہیں

ہر ایک پول میں ہیں اور ہر ایک تار میں ہیں

کھلے ہوئے سے درختوں کے برگ و بار میں ہیں

وہ اک درخت سے لٹکا ہوا سا ہے مہِ نو

دلِ شکستہ نشیمن اسی طرف ہے چلو

تذبذب

شمال کی سمت تھے جو بادل جنوب میں جا کے رک گئے ہیں
ہوا میں پرچم کی طرح لہرا رہی ہیں اک نازنیں کی زلفیں
سیاہ موجیں بھنور ہوں جیسے
کہ جن میں سورج کبھی گھرا ہو
وہ چند اک بھٹکے ابر پارے
جنوب سے غرب، غرب سے شرق کو چلے ہیں
تعین رخ ہے سخت مشکل
تسلسل حرکت نظر سے
عجیب کیفیت و اثر ہے
لچکتی شاخوں میں اس حسینہ کو جسم کے لوچ کا سماں ہے
ابھی جو موتی کے دانے برسے
وہ گھل کے ناپید ہو چکے ہیں
گلوں کے منہ دھل گئے ہیں
سبزے میں اور شگوفوں میں تازگی ہے
میں کیوں رکا ہوں
کہیں کہیں جھیل اور جوہڑ بنے تو کیا ہے
کچھ اور چھینٹے اگر پڑیں گے
تو ایسی کلیاں بھی جی اٹھیں گی
جنھیں حوادث نے روند ڈالا

قربِ اوّلیں

مبارک ہو یہ لذتِ قربِ نایاب کا ساغرلب چکیدہ

مبارک ہو دو پیاسی روحوں کا سنگم

یہ لمحہ

یہ کیفِ ازل اور ابد کا خزانہ

میں خوش ہوں کہ میں نے تمھارے شفق رنگ گلشن سے اک پھول توڑا

تمھارے خنک مرمریں جسم کے مس سے دہکی ہوئی آرزوؤں کو تسکین دی

تمھارے مہکتے تھرکتے بدن کی جنوں خیز رنگیں تجلی سمیٹی

اور اس ساعتِ سازگار و خجستہ میں اپنے جنونِ محبت کے سازِ شکستہ کا ہر تار جوڑا

مبارک ہو یہ لمحۂ کیف آگیں

مبارک کہ ہم تم افق کی بلندی میں قوسِ قزح کی فضاؤں میں کھوئے رہے

مری جاں یہی دولتِ دو جہاں ہے کہ اس دار و گیر جہاں میں

کسی کو ملے فرصتِ عشرتِ یک نفس بھی

جہاں نیلگوں آسماں کے تلے

کاروانِ حیاتِ دوروزہ کا حاصل صدائے جرس بھی نہیں ہے

تمھارے مہیں عنبریں گیسوؤں کے تلے

عشرتِ خوابناک محبت کے چند ایک لمحے حیاتِ گریزاں سے چھینے ہیں میں نے

یہ لمحے جو پھولوں کی مہکار کی طرح ان دیکھی منزل کی جانب اڑے جا رہے ہیں

یہ لمحے جو آہوئے رم دیدہ بن کر نگاہوں سے اوجھل ہوئے جا رہے ہیں

تم اس فکر میں کیوں گھلی جا رہی ہو کہ دنیا مجھے او تمھیں کیا کہے گی

یہ دنیا جو ریشم کے نادان کیڑے سے بڑھ کر نہیں ہے

جو رسم و روایات کے ریشمی جال بنتی چلی جا رہی ہے

جسے اتنی فرصت نہیں ہے کہ دم لے کے فکرِ خداداد سے کام لے

یہ سوچے کہ یہ ریشمی تار تو مدفنِ زندگی میں بدلتے رہے ہیں بدلتے رہیں گے

تم اک چشمہ صاف و شفاف و شیریں اور میں

تڑپتا ہوا تشنہ لب ہوں بیابانِ تنہائی زندگی میں

میں ویرانۂ حسرتِ بیکراں میں سسکتا رہا ہوں

مری تشنگی کتنے رنگیں سرابوں کے منظر دکھاتی رہی ہے

مگر تم بلوریں تجلی سمیٹے ہوئے کہہ رہی ہو

مسافر تری تشنگی اہرمن کی کمیں گاہِ بیدادگر ہے

میں لب تشنہ ہوں اہرمن کی کمیں گاہ سے مجھ کو مطلب نہیں ہے

مری تشنگی تجھ کو منظور ہے تو مجھے پھر کسی سے شکایت نہیں ہے

میں اپنی چٹختی ہوئی ہڈیوں، شعلہ زن روح پیاسی نگاہوں کو کس طرح تسکین بخشوں

لاشعور

میں جنھیں بھولا وہ آئے خواب میں

اور میں حیراں کہ یہ شکلیں کہاں سے آ گئیں

کون سا وہ غار ہے جس میں حسینائیں ہیں بند

بیخودی میں ان ستاروں پر میں کیسے ڈال دیتا ہوں کمند

کون او وہ دیو ہے

جس کے فسوں میں ہیں حسیں

کون سے غاروں، ستاروں میں چھپاتا ہے انھیں

کیسے خوابی آسمانوں میں پھراتا ہے انھیں

کیسے افسونی جزیروں میں ملاتا ہے انھیں

وہ جزیرے جو ابھر آتے ہیں بحرِ خواب میں

خود مجھے اس دیو کی صورت نظر آتی نہیں

اور جب بھی جوش میں آتا ہے وہ، یہ صورتیں

یک بہ یک مجھ کو دکھاتا ہے اب آگے بڑھو

ان کو لو آغوش میں لب پر دو بوسے وجد میں
بھینچ لو اس زور سے ان کو کہ رس بہنے لگے
میں یہ کہتا ہوں کہ دم تو مجھ کو لینے دے ذرا
سوچنے دے ان کو دیکھا تھا کہاں
میں نے کب چاہا تھا ان لذت بھرے اجسام کو
کچھ تو مجھ کو یاد کر لینے دے ان ایام کو
جب میں ان کی خواہشوں کی آگ میں جلتا رہا
میں معزز ہوں مجھے رس راگ سے ہے دشمنی
کچھ تو مجھ کو تیز کرنے دے خرد کی روشنی
تاکہ مدھم رنگ رنگیں قہقہوں کے رنگ میں
عیب مخفی رہ نہ جائیں، دیکھ پاؤں میں انھیں
دیو میری سمت تکتا ہے لگا کر قہقہے
قہقہے، جن سے لرز جائے کہستانِ وجود
میں لپٹ جاتا ہوں گھبرا کر دوشیزاؤں کے ساتھ
کتنی دیکھی اور ان دیکھی حسیناؤں کے ساتھ

اور یوں اس دیو کے تھمتے چلے جاتے ہیں سنگیں قہقہے

دور جیسے گونجتی ہوں کتنی توپیں جا بہ جا

دور سے آتی ہو جیسے پھٹتے گولوں کی صدا

میں بڑھا تا ہوں صدائے بوسہ زور سے

ساتھ ہی یہ سوچتا ہوں ان کو دیکھا تھا کہاں

سوچتا ہوں، سوچتا ہوں، سوچتا ہوں بار بار

اور چھٹتی ہی نہیں ماضی کی دھند

پھر یہ چھٹتی ہے تو ہر نادیدنی ہے دیدنی

گفتنی ناگفتنی

یادِ لا حاصل

آج صندوقِ کہنہ جو کھولا ملا
ایک خط جیسے دل کا پھپھولا جلا
یاد کی دھیمی دھیمی ہوائیں چلیں
رفتہ رفتہ عجب آندھیاں چل پڑیں
ڈھکنا تھامے ہوئے گم خیالوں میں ہوں
ایک دیمک زدہ خط کا اب کیا کروں
پھر بھی ہر لفظ ہے ایک رستہ کھلا
آج ذہن کس سمت کو مڑ گیا
مجھ کو لکھ لکھ کے خط جو بلاتی رہی
آج پہچان میں بھی نہ آئے مجھے
سامنے سے گذر جائے تو ہو خیال
میں نے پہلے کہیں اس کو دیکھا تو ہے
ذہن کھلتا رہے، ذہن چلتا رہے

پچھلی یادوں کی ریلیں چلاتے ہوئے
پھر بھی یاد آئے کچھ بھی نہ اس کے سوا
یہ حسیں چہرہ میرا ہے دیکھا ہوا
آج پھر ذہن کس سمت کو مڑ گیا
لیکن اب اس کی یادوں سے حاصل بھی کیا
جس سے بچھڑے ہوئے مدتیں ہو گئیں
کتنی زرخیز تھی اور حسیں وہ زمیں
کتنے پھول اس زمیں سے اگے کیا خبر
جانے اب بھی اس میں وہ سحر ادا
یا جوانی کا افسوں بکھر کر رہا
بے وفا تھی جو وہ اس کا اب کیا گلہ
اور نہیں تھی تو بھی اس کا اب کیا صلہ
اور میں بھی کہاں کا وفادار تھا؟
آج پھر ذہن کس سمت کو مڑ گیا
اک کسک سی مگر اب بھی دل میں ہے کیوں

دل خود اپنے ہی ہاتھوں سے کیوں ہے زبوں

اس کلی پر جو چھایا وہ بھنورا سہی

لیکن ان میں جواب تک ہے وابستگی

دل یہ کہتا ہے دلکش وہ اب بھی تو ہے

اُس پہ چھایا ہوا پہلا بھنورا جو ہے

اور شاید محبت ہو ان کی سوا

آج پھر ذہن کس سمت کو مڑ گیا

قیدی

یہ کہسار سرد آزاد خودرو سبزہ کی وادی کی جھرمٹ میں
کیفِ زندگی سے جھوم اٹھے ہیں
اسی کہسار کی وادی
چٹانوں سے گھرے زندانیوں کا کہنہ مسکن ہے
سکوتِ شب میں آوازیں
ہوا کے دوش پر آزاد طائر
کی طرح اڑ کر بلندی تک پہنچتی ہیں
وہ آوازیں جو زنداں سے نکل کر
چاروں جانب پھیل جاتی ہیں
تو کتے بھونکتے ہیں افسوں کی تند پھنکاریں لپکتی ہیں
درِ زنداں کو توڑو قیدیو!
زندانِ آب و گل نہیں
زندانِ سنگ و خشت و آہن

توڑ کر مثلِ ہوا آزاد ہو جاؤ

جہاں بھی سانپ، کتے، بھیڑیے، افعی محافظ ہوں

بپھر کر تند طوفانی تھپیڑوں، تیز یلغاروں

سے پتھر کی فصیلیں سرنگوں کر دو

سرِ کہسار سرو آزاد خودرو سبزہ کی وادی کی جھرمٹ میں

کیفِ زندگی سے جھوم اٹھے ہیں

یہ سرو آزاد ہیں ان کی جڑوں میں سنگ پارے خود مقید ہیں

یہ پیکرِ انقلاب بھی ہے

کیا خوب وجودِ بیکراں ہے

جو خود ہی زماں ہے خود مکاں ہے

ساحل بھی وہی ہے جو ہے دریا

ساکن بھی وہی ہے جو رواں ہے

ہے فرش نہ سطحِ آب کوئی

اطراف و جہت بھی اک بیاں

ہے پھول، مہک چمک دمک بھی

ناظر بھی نظر میں بھی نہاں ہے
مستی کو ہزاروں تند طوفاں
اک رقصِ طرب کی داستاں ہے
لاکھوں ہی برس کا ایک جھونکا
اندازِ نفس میں نغمہ خواں ہے
ہر پَرتَو عارضی ہے عنصر
ہر فرصتِ حرکت اک سماں ہے
تاریکیٔ و پستیٔ و عدم سب
موجوں کے بکھرنے کا بیاں ہے
گردابِ سخن بھی ہیں ہزاروں
کہنے کو بھی ایک چیستاں ہے
بڑھتا ہوا قافلہ بشر کا
جو سینۂ بحر پر رواں ہے
مقصودِ وجود بھی لیکن
خود مثلِ وجود بیکراں ہے
یہ موج کا اضطراب بھی ہے
یہ پیکرِ انقلاب بھی ہے

انقلابِ نو

زمیں ہے ایک سیارہ
فلک پر لاکھوں سیارے
اور اس سے آگے لاکھوں اور سیارے
سراپا نغمگی ہیں، رقص ہیں، رامش گرِ افلاک ہیں تارے
ثوابت بھی کروڑوں ہیں
جو اپنی روشنی کی چشمکوں سے رقص پرور ہیں
خلا میں کس کے درباں اور ہرکارے ہیں اب تک بے خبر ہیں ہم
نہ یہ درباں، نہ ہرکارے، نہ خیالاتِ مجسم ہیں
وجودِ محض کے رخسار پر قطراتِ شبنم ہیں
وہ شبنم جو کروڑوں سال میں تحلیل ہو پائے
مگر ہم چند روزہ گریہ آلودہ تبسم ہیں
چلو پھر کیا ہے؟
کیا یہ بات کچھ کم ہے کہ ہم وقفِ ترنم ہیں
ہمارا عشق آفاقی ہمارے گیت آفاقی
اور اس آفاقیت کے رہ نوردِ معتبر ہم ہیں

کروڑوں مہر و ماہ و مشتری مریخ و زہرہ ہیں

سبھی اک رقصِ آفاقی و نغماتِ جہانی بے پیمبر ہیں

زمیں کے رقص اور نغمے

وہ لہریں ہیں جو حرکات اور آوازوں میں ڈھل کے

آسماں کے بیکراں سینے میں گونجی ہیں

ہم ان نغموں کے پیکر، سازِ ہستی کی صدائے بیکراں بھی ہیں

ہم اپنا ساز بھی ہیں ساز کی آواز بھی ہیں جاوداں بھی ہیں

زمیں کے ہم پیمبر ہیں

زمیں ہے ایک سیارہ جہاں سے ابتدا کی تھی

اور ان افلاک کے تاروں سے اپنی ابتدائے نو کریں گے ہم

فتح

بیکراں بیکراں، جاوداں جاوداں

جلوۂ ہست و بود آسماں آسماں

کیمیائے حیات ایک جادوگری

جس کا ساحر ہے خود جزوِ صورت گری

انقلابوں کی امواج ابھرتی ہوئی

موج در موج ہستی سنورتی ہوئی

بزمِ فطرت میں ہے ایک سی بود و باش

اور محرومیاں فیضِ نظمِ معاش

رنج و حرماں خود انساں نے پیدا کیے

کیوں چلے آدمی خود کو تنہا کیے

میں بھی تنہا ہوا تو بڑھے یہ حصار

جیسے سینے پہ چڑھ جائیں گے کوہسار

توڑ ڈالیں مگر میں نے حد بندیاں

ذرہ ذرہ بنا پھر مرا رازداں

چاند تاروں سے میری محبت بڑھی

سبزہ و گل سے میری رفاقت بڑھی

رقص کرتی ہوا وجد کرتے شجر

مسکراتی شفق مہکی مہکی سحر

پتے پتے کے رقصِ طرب میں رہا

جاوداں عشرتِ بے طلب میں رہا

نغمۂ میر سیارگاں کے سنے

کتنے خاموش بول آسماں کے سنے

زہرہ و مشتری و زحل میں رہا

چاند کی چاندنی کے محل میں رہا

روز و شب کے تغیر کی کیف آوری

بیکراں ذات کا حسنِ جادوگری

موسم آتے رہے اور جاتے رہے

نت نئے رنگِ ہستی دکھاتے رہے

غم ڈبوئے بہت بحرِ زخار میں

جال توڑے بہت زودِ رفتار میں

زندگی رقص ہے، وجد ہے، گیت ہے

جس نے سمجھا اسی کی یہاں جیت ہے

سحر ہونے تک

مہیب شب کا وسیع جنگل بھرے ہوئے بادلوں سے پر ہے
سفید بادل نکل رہے ہیں فضا ابھی موتیوں سے پر ہے
سیاہ بادل برس رہے ہیں
کڑکتی بجلی گرجتے بادل کہ جیسے شیروں کی ہوں دہاڑیں
یہ سخت بادل برس رہے ہیں کہ ذوقِ روئیدگی ابھاریں
کہ ذرے اب بھی ترس رہے ہیں
برس چکیں گے تو دھوم ہوگی طرب کے ہوں گے حسیں زمانے
امنڈتی ندیوں کے نغمے ہوں گے عظیم دریاؤں کے ترانے
جواب تصور میں بس رہے ہیں
ہوائیں طوفاں بدوش ہوں گی ستم کے قصر و محل گریں گے
جو ہر طرف ہیبت آفریں تھے وہ دیو مکر و دغل گریں گے
جواب بھی چھپ چھپ کے ہنس رہے ہیں
اگرچہ کٹیائیں بھی گریں گی مگر اجالے بھرے گھروندے
حیات کی سرخوشی سمیٹے سکونِ امن آشتی سمیٹے
یہ دیکھ لیں گے کہ بس رہے ہیں

زبانِ خاموش سے یہی گھر سر آسماں کی طرف اٹھا کر

کہیں گے اس دورِ نو کے انساں زمین کو آسماں بنا کر

جفا گروں پر برس رہے ہیں

کہیں گے فردوسِ گمشدہ کی تلاش سے ہاتھ اٹھا چکے ہیں

زمیں کو جنت بنا چکے ہیں، ہم اپنی منزل کو پا چکے ہیں

تو اور میں

یہ کیا ہو گیا ہے!!!
کہ میری صدا خود مرے ہی لیے اجنبی ہے
جو تجھ کو سناؤں تو حیرت میں ڈوبے
ترے بھولپن کا ہر اک جال ٹوٹے
یہ جتنی پرانی ہے اتنی نئی ہے
سنو ہاں سنو کیا صدا کہہ رہی ہے
بدن ہی بدن ہے یہ مانو نہ مانو
ترنم فشاں آبشار اک بدن ہے
یہ چاند اور سورج زمیں اور ستارے
یہ جھیلیں یہ دریا یہ ندی یہ نالے
بدن ہی بدن ہے جو کچھ دیکھتی ہو
یہ سبزہ یہ پیڑ اور زمیں سب بدن ہے
ہوس بھی بدن ہے زمیں بھی بدن ہے

رسوم و روایات کی جامہ زیبی

بدن کے مظاہر، لباسِ بدن ہیں

بدن ہی سے وحشت بدن ہی سے راحت

بدن ہی سے طوفانِ جذبات بھی ہے

یہ پھول اور بھونرے یہ پنچھی بدن ہیں

ہوا بھی بدن ہے بدن ہی ہیں سانسیں

چٹکتی ہوئی نرم کلیاں بدن ہیں

ہواؤں کے دامن میں خوشبو بدن ہے

ستارے بدن ہیں زمیں بھی بدن ہے

فضا بھی بدن ہے خلا بھی بدن ہے

بدن میں بدن کے ستارے رواں ہیں

بدن ہی کی آندھی کا مظہر جنوں ہے

بدن ہی سکوں ہے بدن ہی فسوں ہے

فنونِ لطیفہ بدن کی صدائیں

مغنّی کی تانیں بدن کی پکاریں

بدن کی پکاریں حسیں آبشاریں

گلا گھونٹ دیں بیکراں خواہشوں کا

تو پھر جھوٹ کی سربلندی رہے گی

تو پھر جھوٹ کی فتح یابی رہے گی

یہ پاکیزگی روح تقدیس سارے فسانے

لباسِ ریا مکر کی خلعتیں ہیں

یہ روح اور روحانیت کا ترانہ، طمع گری اور بازی گری ہے

بدن ہی خلوصِ وجود آفریں ہے

وہ مینا اٹھا جام بھر رقص کر

بدن سے ترانوں کا جادو چلے

میں مضراب ہوں بربطِ زندگی کا

دھرا رہ گیا میں تو پھر کیا بنے گا

غلافِ غبارِ زمانہ پڑے گا

شعبدہ بازوں سے

آسماں نیلا ہے لیکن زرد ہی کہتے رہو
اور زمیں کو کہہ کے عکسِ آسماں نیلی کہو
دق سے جو اجسام ہوں تحلیل انھیں نازک کہو
تذکرہ ان کی لطافت اور نزاکت کا کرو
کہہ دو ہے سمیّت وقتی خمار افزا بہت
لطف کا دریا بہت
بجھتے چہروں کو جو پاؤ 'سخت نمیالے' کہو
رنگ کی دنیا میں ہے یہ رنگ سب سے لاجواب
ان کے مٹتے نقش جو دیکھو انھیں دلکش کہو
اور ٹھہراؤ مصور کے حسیں خوابوں کے روپ
دیویوں کا ہی سروپ
آڑی ترچھی کچھ لکیریں کھینچ کر رنگیں کرو
رنگ کے بھی یوں ہی کچھ چھینٹے سے دو قرطاس پر

اور لہو ہے دردِ انسانی کا تجریدی نمود

ہے بشکلِ رنگ و قوس و خط فقط غم کا سرود

مفلسی کے سیل میں بہتی ہوئی خاشاکِ زیست

جس جگہ دیکھو لہو سحر ہم آغوشی ہے یہ

خود فراموشی ہے یہ

میں نے ایسے جسم بھی دیکھے جو چٹخے تھے تمام

زلزلوں کے زور سے جیسے چٹختی ہے زمیں

بادِ افرنگی سے پھٹ کر جو ہوئی تھے لاعلاج

تم کو کیا، کیا ہے سماج

تم نے دیکھا ہو تو ان کو منجمد آتش کہو

ہے قلم تیشہ مرا، سنگیں حقائق میرے سنگ

روز و شب جن پر لگاتا ہوں میں ضربِ نرم و گرم

رفتہ رفتہ ان کے خد و خال ابھرتے ہیں سبھی

پھر ٹھٹکتا ہوں کہ ان کو کیسے مانوں وہ صنم

جن کی آنکھوں اور ہونٹوں میں چمک اور رنگ ہے

اور بدن پھولوں کی صورت نرم ضدِ سنگ ہے
حسن کا فرہنگ ہے
جس کے دم سے من کی ٹھہری جھیل میں آتی ہو لہر
کھلتے ہوں احساس کے وہ دلنشیں رنگیں کنول
جیسے سنگِ میل ان دیکھی زمینِ سحر کے
جن سے رستے جاتے ہوں سوئے طلسمانی محل
جن میں مے بہتی ہو ہر ذرہ ہو رقص و وجد میں
راگ کی اور رنگ کی لہریں ابھرتی ہوں جہاں
کتنی ہی نادیدہ خوشیوں کے ابھرتے ہوں سماں
جن کا کوئی رنگ اپنے خامہ پر دھر دوں
اپنی نظموں میں بھر دوں
تو میں ایسے بت بناؤں جن سے آنکھیں خیرہ ہوں
لیکن ان حالات میں کیا دلکشی پیدا کروں
آبرو جن کی نہیں کوڑی کی بہر اہلِ حکم
دیتے ہیں الزام غداری کدورت ساختہ

جن کا غم کھاتا ہوں پتھر مارتے ہیں وہ مجھے

چشمِ حیرت دیکھتی ہے باحواس باختہ

میں پرستارِ صنم ہوں اور نہ ہی اصنام گر

میرے ہاتھوں سے جو چہرے آ گئے ہیں سامنے

وہ بھیانک ہوں اگر تو اس میں میرا کیا قصور

کرتے ہیں جلاد پیشہ تو کریں مجھ سے نفور

میں تو خود ان صورتوں سے سخت گھبرا کر کبھی

شہپرِ تخئیل کی پرواز سے لیتا ہوں کام

جن سے لیتا ہے یہ اپنا انتقامِ نفسی

مسخ کرتا ہے یہ چہرے ڈال دیتا ہے خراش

ان کی یہ فہرستِ الزامات ہے لمبی بہت

ان بلند آہنگیوں میں من کی پستی ہے بہت

ان کے ہر سنگین حرف و لفظ کو دیتا ہوں رنگ

میرے خونِ دل میں جن کے ڈوبے رہتے ہیں سنگ

پتھروں کی شکل میں اپنی ہی شکل حال ہے

کیوں یہ قیل و قال ہے

اور نکل جاتا ہوں ان دیکھے جزیروں کی طرف

ڈھونڈھ لیتا ہوں کوئی دلکش وفا پیکر وجود

اور ابھرتے ہیں قلم کی نوک سے اس کے نقوش

لیکن اس پر بھی یہ سارے معترض بد بیں حسود

اک نہ اک مزمن حسینہ یا جمال حادکو

ڈھونڈھ کر لاتے ہیں کہتے ہیں یہ ان کے ہیں نقوش

اس نے شعروں میں انھیں سے کی ہے یہ صورت گری

ورنہ کب حاصل ہے اس کو آج کل کوئی پری

اس کے بھی اعصاب پر ہیں یہ حسینائیں سوار

اور زبانی لذتِ جنسی کی ہے کاری گری

یا خود اپنی شدتِ محرومیٔ جنسی سے یہ

تنگ آ کر ہو گیا ہے ایک افسانہ تراش

یا گل گری کہو، رنگینیٔ خواہش کہو

رنگ کی بارش کہو

جن کا غم کھاتا ہوں پتھر مارتے ہیں وہ مجھے
چشمِ حیرت دیکھتی ہے باحواس باختہ
میں پرستارِ صنم ہوں اور نہ ہی اصنام گر
میرے ہاتھوں سے جو چہرے آ گئے ہیں سامنے
وہ بھیانک ہوں اگر تو اس میں میرا کیا قصور
کرتے ہیں جلاد پیشہ تو کریں مجھ سے نفور
میں تو خود ان صورتوں سے سخت گھبرا کر کبھی
شہپرِ تخئیل کی پرواز سے لیتا ہوں کام
جن سے لیتا ہے یہ اپنا انتقامِ نفسی
مسخ کرتا ہے یہ چہرے ڈال دیتا ہے خراش
ان کی یہ فہرستِ الزامات ہے لمبی بہت
ان بلند آہنگیوں میں من کی پستی ہے بہت
ان کے ہر سنگین حرف و لفظ کو دیتا ہوں رنگ
میرے خونِ دل میں جن کے ڈوبے رہتے ہیں سنگ
پتھروں کی شکل میں اپنی ہی شکل حال ہے

کیوں یہ قیل وقال ہے

اور نکل جاتا ہوں ان دیکھے جزیروں کی طرف

ڈھونڈھ لیتا ہوں کوئی دلکش دفا پیکر وجود

اور ابھرتے ہیں قلم کی نوک سے اس کے نقوش

لیکن اس پر بھی یہ سارے معترض بد بیں حسود

اک نہ اک مزمن حسینہ یا جمال حادکو

ڈھونڈھ کر لاتے ہیں کہتے ہیں یہ ان کے ہیں نقوش

اس نے شعروں میں انھیں سے کی ہے یہ صورت گری

ورنہ کب حاصل ہے اس کو آج کل کوئی پری

اس کے بھی اعصاب پر ہیں یہ حسینائیں سوار

اور زبانی لذتِ جنسی کی ہے کاری گری

یا خود اپنی شدتِ محرومیٔ جنسی سے یہ

تنگ آ کر ہو گیا ہے ایک افسانہ تراش

یاد گل گری کہو، رنگینیٔ خواہش کہو

رنگ کی بارش کہو

بات کیا ہے کس کا ڈر ہے شعبدہ بازو تمھیں

ڈر حقائق سے ہے کہ ظالم سے کہ اپنے آپ سے

منظرِ غم اور صدائے درد سے چھپتے ہو کیوں

نیچے کیوں آتے نہیں ہوا اپنے قصرِ خواب سے

میں کون ہوں؟

میں کون ہوں؟
میرے لاکھوں ہی نام
لاکھوں مظہر
وجود کا بحر بیکراں ہوں
کروڑوں برسوں کے ارتقا کی بھی داستاں ہوں
مری صدا میں تری صدا ہے
کہ ہر صدا میں
وجود تابندہ جاوداں کی ہے نغمہ ریزی
ہر ایک 'میں' ایک حسیں اشارہ
جو حسنِ آواز بن رہا ہے
یہ سب اشارے
جو ایک 'میں' سے ابھر رہے ہیں
وجود کے بیکران و بے تہہ بسیط جوہر

عمیق باطن کے بحر کی سطح کے کنول ہیں

جدا جدا بھی ہیں ساتھ بھی ہیں

ابھر رہے ہیں بکھر رہے ہیں

بکھر رہے ہیں، ابھر رہے ہیں

جو مر رہا ہے وہ زندگی کے نئے مظاہر میں ڈھل رہا ہے

عظیم ذرّوں کا ارتقائی شعور بھی

شانِ ممکناتِ وجود کا ایک رخ رہا ہے

میں جانتا ہوں

کہ زندگی کی صلیب پر ایک ایک لمحہ

مرے تنفس میں رچ کے مصلوب ہو رہا ہے

مرے بدن کا ہر ایک ریشہ

ہر ایک ذرہ

پیالۂ حرفِ ناموافق کے سُم سے مسموم ہو رہا ہے

وہ کون تھا؟

جس نے زہر کا پیالہ جام مے کی طرح پیا تھا

وہ کون تھا؟

جو صلیب پر آفتاب تاباں بنا ہوا تھا

جو بادلوں کے عمیق سایوں میں

بادوباراں میں

آسمانِ وفا پہ تابندہ تر ہوا تھا

وہ کون تھا؟

جس نے گھر لٹایا

تمام کنبے کی گردنیں دیں

اور اپنا سر دے کے جاودانی حیات کا راستہ دکھایا

وہ بے بسی کے سلاسلِ آہنی میں جکڑا

وہ کون تھا کوہ قاف کی اک بلند چوٹی پہ سر جھکائے (۱)

(۱) پروی تھی اس۔ یونانی صنمیات کی رو سے عقل کا دیوتا

جسے دیوتاؤں نے وہاں مقید کر دیا تھا۔ سلیم واحد سلیم)

جو آج آزاد ہو گیا ہے

جو رنگ برنگی سراب کی تابشوں سے بچ کر

نشانِ منزل کو ڈھونڈھتا ہے

نشانِ منزل جو ارتقا کی اٹل کڑی ہے

اگر چہ یہ راہ اژدہوں کی

مہیب پھنکار سے بھری ہے

فضائیں عنبر فشاں نہیں ہے

مگر ہر اک ذرہ عنبریں ہے

سیاہیوں کے بھنور ہیں ہر سو

کئی حسیں اور کئی حسینائیں

ناگ ناگن ہیں

جن کی پھنکاریں سن رہا ہوں

عمیق اندھیرا

تمام اطراف سے امنڈ کر مجھے بھنور میں ڈبو رہا ہے

میں مر رہا ہوں

مگر نئی زندگی کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں

وہ سانچے جو سرخ سرخ شعلوں

[illegible] کرنوں [illegible]

سراب

سڑک پر جگمگاتی دھوپ

کرنیں جیسے آئینے پہ پڑتی ہوں

حسیناؤں کے لہراتے ہوئے آنچل

ہزاروں بادبانی کشتیوں کے بادبانوں کی طرح

انبوہ در انبوہ انسانوں

کے دریا میں ابھرتے ہیں

نہ یہ دریا نہ وہ رستہ

نہ کوئی بادبانی کشتیوں کی بحر پیائی

ہوا سے جھولتے اشجار

سورج کی تمازت

کے مقبل میں تھرکتے ہیں

ہزاروں لوگ ایسے بھی ہیں

جو ہر سو بھٹکتے ہیں

میں خود مدت کا اک بھٹکا ہوا راہی
ہر اک آواز ہر آہٹ ہر اک رنگیں اشارے پر
بصارت اور سماعت کے سرابوں میں
ہزاروں رنگ بھرتا ہوں
یگانے اور بیگانے
سبھی اک وحدت کرب آفریں ہیں اب
یہ کیا جھنکار ہے
پازیب کی ہے؟
جام ٹوٹا ہے کہ کوئی ساز ٹوٹا ہے؟
نہیں!! للکار ہے؟ للکار کیسی ہے؟
کسی ساحر کی شیشوں کی دکاں میں
زور سے للکار گونجی ہے
اگر شیشے ہماری قامت وقد کے فسوں کا راز
آرائش کدوں میں عام کر ڈالیں
تو پھر ظاہر تو کیا

باطن کی بھیانک بدنمائی

عام انسانوں پہ آخر فاش ہو کر

نظمِ ہستی کو مٹا دے گی

ذرا چمکاؤ آئینے

کہ عکسِ رخ

کسی صورت سے بہتر ان میں آ جائے

نہیں تو توڑ دو شیشے

اور اپنے آپ کو حسنِ جہاں کا ترجماں سمجھو

حقیقت کا جہاں سمجھو

کہ آئینِ جمال

آرائشِ رخسار و گیسو و کمر تک ہے

نظر تک ہے

ہر اک آئینہ حیراں ہے

کہ سنگ و خشت و آہن کا یہ ایواں ہے

کئی ہیں سنگ بر کف

اور قصرِ زرگری میں ایک طوفاں ہے

اور اس کے ساتھ ہی

اس قصر کے باہر

کروڑوں چیختے چلاتے انسانوں میں ہیجاں ہے

کہاں سے کس طرف کو سنگ جائے گا

زمانہ منتظر سا ہے

مگر یہ کیا سماعت اور بصارت کا سرابِ معتبر سا ہے

الہام سے خرد تک

کتنے انسانوں نے تخئیل کے بت خانوں میں
کتنے موہوم خداؤں کو کیا ہے تخلیق
اپنے ہی ذہن کی مخلوق کو خالق کہہ کر
بندگی کے لیے کتنے ہی تراشے ہیں طریق
آتش و باد کے آگے بھی رہا سجدہ فگن
وہم نے اور بھی کتنے ہی بنائے معبود
سینکڑوں راگ رچائے گئے اوتاروں کے
عبدیت کے سنائے گئے کتنے ہی سرود
صاحب وحی اٹھے صاحب پیغام اٹھے
وقت کے ساز پہ گائے گئے الہام کے راگ
خرد و عقل کے خرمن پہ شرارے برسے
علم و دانش کی کتابوں میں لگائی گئی آگ
خانقاہوں میں تقدس کے لبادے اوڑھے

رہزنِ عقل بچھاتے رہے تقدیر کے جال
بے نواؤں کو ہوئی صبر و رضا کی تلقین
اہلِ ثروت کے چھپائے گئے سنگین اعمال
کتنے اٹھے عَلَم رشد و ہدایت لے کر
آدمیت مگر اس طور بھی گمراہ ہوئی
خیر کے چاہنے والوں نے وہ پھیلایا شر
کہ زمیں اہلِ غرض کے لیے جنگ گاہ ہوئی
صاحبِ سیف اٹھے ظلِ الٰہی بن کر
سامنے آتے رہے اوڑھ کے مذہب کی نقاب
عظمت و ہیبت و شوکت کا بھرم رکھا کر سکے
محفلِ عیش میں پیتے رہے جامِ مئے ناب
یہ معابد یہ مساجد یہ کلیسا یہ کنشت
ایسی راہیں ہیں کہ جن کی کوئی منزل ہی نہیں
کتنے فانوس مگر روشنیٔ شمع کہاں
کتنے محمل ہیں مگر لیلائے محمل ہی نہیں

یہ توہم کے کرشمے یہ طلسمی شہکار
ان کے پردے میں ہلاکت کے سوا کچھ بھی نہیں
ذہن تاریک میں ابھرے ہوئے سہمیدہ خیال
شعبدہ بازیٔ ظلمت کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ تقدس کے فسانے یہ مقدر کا فسوں
انہی حربوں سے حفاظت ہوئی زرداروں کی
اب کہ تقدیر و تقدس کا فسوں ٹوٹ چکا
ہم کو شاہوں کی ضرورت ہے نہ اوتاروں کی
اب کہ ہے عقل و خرد کا مہِ تاباں روشن
ذرے ذرے میں جہاں تاب اجالا ہوگا
اک نئے رنگ سے نکھرے گی عروسِ گیتی
سحر و ظلمات کا ایواں تہ و بالا ہوگا
پستیاں جوشِ بغاوت سے ہوئی ہیں بیتاب
رفعتیں لرزہ براندام ہوئی جاتی ہیں
صحنِ گلشن میں یہ پامال فسردہ کلیاں
اک نئے دور کا ہنگام ہوئی جاتی ہیں

عجب سماں ہے

عجب سماں ہے
غمِ بہار و نشاطِ عہدِ خزاں ہیں باہم
خزاں کے پتے بھی گر رہے ہیں
نئے شگوفے بھی کھل رہے ہیں
ہوا میں بھی سرسراہٹیں ہیں
بدن میں بھی سنسناہٹیں ہیں
کوئی نہیں ہے تو کیا ہوا ہے
وہ ہرنیاں جو کبھی تھیں ہمدم
انھیں کی یادوں سے ایک اک کر کے گل کھلائیں
تو گیت گائیں
کوئی خوشی دائمی نہیں تھی
کوئی خوشی دائمی نہیں ہے
تو غم بھی کب جاوداں ہوا ہے
یہ چند لمحے، مسرتِ دائمی کے ساغر
چھلک رہے ہیں تو پی پلائیں

کبھی وہ بچھڑے بھی آملیں گے

کہ جن کے غم برگ و بار بن بن کے جھڑ گئے ہیں

مگر نئے برگ و بار بن کر نئے شگوفوں کی بُور بن کر

حیات کی زخم خوردہ شاخِ شجر پہ پھر جلوہ گر ہوئے ہیں

آنے والے عظیم آدمی کے لیے

آج کا واقعہ کل کی تاریخ ہے
کل کی تاریخ اک داستانِ کہن
گرتے پتے گنو، اگتے پتے گنو
ان گنت ہیں مگر واقعاتِ چمن
کیا ہے تاریخ، بوسیدہ اوراق ہیں
جس کا ہر نقشِ پارینہ مٹ جائے گا
ہر حکایت کو ہو گا زوال تمام
طاقِ نسیاں میں ایک ایک حرف آئے گا
جس کو دیمک نہ چاٹے تو گل جائیں گے
طاقِ نسیاں کے سانچے میں ڈھل جائیں گے
چند الواح چند اک نقوش آج کے
رہ گئے بھی تو سامانِ حظ ہوں گے سب
آنے والے عظیم آدمی کے لیے
آج کا واقعہ کل کی تاریخ ہے

شکستِ یاس

آج پھر کشتیِ امید مری ٹوٹ گئی
آج پھر وقت کی ہر سانس رکی جاتی ہے
پھر ہے رگ رگ میں غم درد کی جاں کاہ خلش
ہر خوشی اشک کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے
آج پھر روح پہ طاری ہے المناک سکوت
آج پھر زیست ہے اک نغمۂ پُردرد وخموش
یاس کی ظلمتِ پُرہول نے گھیرا ہے مجھے
لطفِ ہستی ہے نہ جینے کی تمنا کا ہے جوش
میں تھا اک راہروِ گم شدہ منزل لیکن
تو نے ہر وقت سرِ راہ پکارا تھا مجھے
میں نے جینے کی ہر امید سے منہ موڑا تھا
تو نے جینے کے لیے پھر سے ابھارا تھا مجھے
بن کے خورشید مرے غم کدۂ ہستی میں
تو نے کچھ روز شعاعوں کا فسوں پھونکا تھا
اور تری زلفِ عنبر کے گھنے سائے میں

میں ہر اک رنج ہر اک درد بھلا بیٹھا تھا
آج پھر آ کے اسی رہ پہ مجھے چھوڑ دیا

جس جگہ تو نے کھڑے ہو کے پکارا تھا مجھے
آج ہے دل پہ وہی یاس کا عالم طاری

جبکہ جینے کے لیے تو نے ابھارا تھا مجھے
سوچتا ہوں کہ اسی راہ میں پہلے کی طرح

پھر تری طرح سے کوئی مجھے آواز نہ دے
اور کوئی ساحلِ امید دکھا کر اے دوست

اک نئے سُر سے مجھے شوقِ تگ و تاز نہ دے

اپنے خواب کی تعبیر

بس ایک خواب مگر کتنا بے کراں وحسیں
کہ جس کا دیکھنے والا بہک بہک جائے
جو حدِ ہست ہو کوئی تو ماورا بھی ہو
وگرنہ صرف خیال ایسے اوج تک جائے
کہاں ہیں دودھ سے پانی کی مشکبو نہریں
کہ جس میں تیرتے ہوں طائرانِ طیرانی
کہاں ظروف مرصّع ہیں سونے چاندی کے
مۓ طہور کرے جس سے نکہت افشانی
جواہرات کے پیڑ اور جواہرات کے تخت
جہاں ہیں دور میں یاقوت کے صراحی و جام
کہاں ہیں حجرۂ الماس و قصرِ مروارید
جہاں و ماں کو حاضر ہیں دائمی اصنام
یہی بہشت ہے، معراج بھی یہی کچھ ہے
کہ ہم زمیں پہ کریں اپنے خواب کی تعبیر
بشر کو کیفِ اخوت سے ہمکنار کریں
یہی خوشی ہو طہوری شراب کی تعبیر

نور جہاں

شہی کو پھول جو آیا پسند گلشن میں
تو شاخِ گل سے اسے بے تکان اتار لیا
محل کی بزمِ شہی کو جو رونقیں بخشیں
تو دل میں ڈوبتے جذبات کو ابھار لیا
لہو میں کوئی نہایا پکار کر تاریخ
مگر سیاہیٔ صفحات بعد میں ابھری
جہاں کسی نے بھی رودادِ خوں چکاں لکھی
سفینہ بن کے تشکک کے بحر میں اتری
یہ پھول جب تھا کلی، قصر کے گلستاں میں
کسی کبوترِ معصوم کو اڑایا تھا
مؤرخ اس کو اسیرِ ادا بتاتا ہے
دل اس ادا پہ نہیں غنچگی پہ آیا تھا

نوائے فراق

(سالک کے ارتحال پر)

وہ رسم و راہِ محبت کا رہروِ کامل
غضب ہوا کہ نگاہوں سے ہوگیا اوجھل
قدم بڑھاؤ ذرا تیز کارواں والو
کہ یارِ قافلہ اپنا گیا ہے دور نکل
جو باخبر تھا نشیب و فرازِ منزل سے
اڑا کے لے گئی اس کو بھی گردبادِ اجل
وہ اک متاعِ گراں کاروانِ ہستی کا
سکوتِ مرگ بنا اس کی راہ کی دلدل
وہ روشنی جو ہر اک گام رہ دکھاتی تھی
گئی ہے ظلمتِ مرگِ بہانہ ساز نگل
اگرچہ تھا نہ کوئی موقعِ وداع ابھی
نہ دوستوں سے بچھڑنے کا تھا یہ کوئی محل

عزیز وصبر کہ وہ خود بھی غم کے طوفاں میں

ہمیشہ تھا متبسم ہزار ہو بیکل

رکو امنڈتے ہوئے آنسوؤ خدا کے لیے

غمو مچاؤ نہ اس طرح روح میں ہلچل

کہ اس نے ہنستے ہوئے زندگی گذاری تھی

اندھیری رات میں روشن ہو جس طرح مشعل

مگر سکوں ہو تو کیسے کہ غم رہا ہی نہیں

وہ جس سے راحتِ دل تھی وہی یہاں نہ رہا

جو ایک عمر لٹاتا رہا شرابِ سخن

وہ زیب و زینتِ بزمِ سخنوراں نہ رہا

خلوص جس سے عبارت تھا اس زمانے میں

وہ باوفا ہی سرِ بزمِ دوستاں نہ رہا

جو ہر قدم پہ چہکتا تھا مثلِ طائرِ قدس

وہ نغمہ سنج وہ خوش گو وہ خوش بیاں نہ رہا

جو حادثوں میں تھا سینہ سپر ہر اک کے لیے

وہ غم گسار، وہ مونس، وہ مہرباں نہ رہا
صدا تھی جس کی فسردہ دلوں کو تاب و تواں
وہ خوش نوا وہ حدی خوانِ کارواں نہ رہا
مگر نہیں، وہ فنا کو بھی دے گیا ہے شکست
بقا نے اس کا کیا ہے خوشی سے استقبال
وہ ایک پل میں ابد سے ہوا ہے ہم آغوش
وہ جس کی ذات پہ نازاں ہے اس کا رزِ وصال
وہ بزمِ قدس میں بھی تازہ دم ہی پہنچا ہے
نہیں ہوا ہے سفر کی صعوبتوں سے نڈھال
اسی خیال سے شاید کہ صبر آ جائے
اگرچہ اس کی جدائی سے ہے شدید ملال
ہم اس کی یاد کو اب حرزِ جاں بنائیں گے
اک اور نقشِ غمِ رفتگاں بڑھائیں گے

خدایانِ جمہور کا فرمان

(قوم کے نام)

مناؤ جشن زبوں حالو! بن چکا دستور
مہیب خطروں کی زد میں تمہارا ہے جمہور
رہی ہماری حکومت تو یہ ضروری ہے
کہ اہلِ ملک میں کوئی نہیں ہے اہلِ شعور

☆☆☆

مناؤ جشن کہ طوفانِ حادثات میں آج
تمہارے واسطے کاغذ کی کشتیاں ہیں بہت
عدو کا خوف وطن کی محافظت ہے عبث
کہ ہم ہیں اہلِ حکومت تو مہرباں ہیں بہت
گیا جو دورِ غلامی تو ہم کو سجدہ کرو
کہ آدمی کے مقدر میں سجدہ ریزی ہے
کرو سلام کہ ہم ہیں خدائے جمہوری

ہمارے دم سے اخوت کی جلوہ ریزی ہے

مٹا جو عہدِ ملوکیت و شہنشاہی

تو اپنی قوم کے فرماں رواؤں کو مانو

نہ انتخاب ہے لازم نہ مجلسِ شوریٰ

ہمیں کو منتخب و مجلس و وطن جانو

سوال بھی کوئی گستاخ و بے ادب نہ کرے

کہ بندگی میں توکّل کی شرط لازم ہے

عذابِ ذلت و تحقیر ہے تو پھر کیا ہے

یہ کم ہے کیا کہ متاعِ حیات قائم ہے؟

یہ کیا کہا کہ خطا کچھ نہیں، نہیں نہ سہی

خطا کی شرط نہیں ہے کسی سزا کے لیے

ذلیل کیڑو مکوڑو! جھکو ہمارے حضور

ہے جس طرح سے روا بندگی خدا کے لیے

زبان کھولو نہ گستاخ و بے ادب لوگو!

کہ نظم و نسق تو خیراتِ حکمرانی ہے

بصد نیاز بجالاؤ شکر ہم وطنو!
کہ اپنی قوم میں کس درجہ سخت جانی ہے
پھلو گے پھولو گے دنیا میں تم اسی صورت
کہ اس وطن میں ہمیں حکمراں رہیں دائم
پڑھو ہمارے قصیدے کرو ہمیں تسلیم
وطن رہے نہ رہے، ہم کو تم رکھو قائم
نہیں ہے جامۂ تن، من کی کیا ضرورت ہے
رہیں لوازمِ ہستی تو زندگی ہے ضرور
نہیں بادہ وساغر تو کیوں ہوے خواری
نہیں ہے طاقتِ بادہ کشی تو کیسا سرور؟

☆☆☆

جو سر میں ہے کوئی سودا تو سنگ پر پٹکو
کہ نامرادوں کو حاصل نہ ہو سکے گی مراد
پڑھو قصیدہ ہمارے حضورِ اقدس میں
تمھاری زیست ہو آباد یار ہے برباد
بجا ہے بھوک ہے عام اور غموں کی کثرت ہے
ہر اک کا اپنا ستارہ ہے اپنی قسمت ہے
کہاں چلے ہو مٹانے نوشتۂ تقدیر
جنوں زدو! تمھیں زنداں کی ضرورت ہے

آہنی عزم

سوچ لے جانِ حیات
کئی صدیوں کے بہیمانہ روایات کے جال
توڑ سکتے ہیں ترے پھول سے ہاتھ؟
تو کہ شاداب پہاڑوں سے ہے بڑھ کر شاداب
اور کلیوں کی طرح نرم و گداز
نشترِ غم کی چبھن سے تو نہیں تڑپو گی
ناامیدی کی سُم آلود فضاؤں کا غبار
تیرے دل پر تو نہیں بیٹھے گا
دیکھتے دیکھتے مرجھا تو نہیں جائے گی تو
سوچ لے جانِ حیات
ہر قدم راہ میں پھیلائے ہوئے خاروں کو
دیکھ کر تیرے قدم رک تو نہیں جائیں گے؟
نقرۂ و زر کی حسیں جھنکاروں سے
بے نیازانہ گذر جائے گی تو؟

اور مرے ساتھ محبت کے سنہرے نغمے
گا سکے گی مری جاں ڈر تو نہیں جائے گی تو؟
سوچ لے راہ ہے مشکل کتنی
تیرا نازک سا بدن
دے بھی سکتا ہے مصائب کے تھپیڑوں کا جواب؟
سوچ لے جانِ حیات
آہنی عزم کے ساتھ
دے مرے ہاتھ میں ہاتھ
چلیں منزل کی طرف
اپنی منزل کی طرف

صحبتِ نیک

مجھے اک روز خوشبو دار مٹی
مرے اک دوست نے حمام میں دی
کہا میں نے یہ اس مٹی سے اے گِل
تری خوشبو پہ میرا مست ہے دل
بتا تو مشک ہے، عنبر ہے کیا ہے
تری خوشبو پہ میری جاں فدا ہے
کہا اس نے گِلِ ناچیز ہی تھی
مگر کچھ روز پھولوں میں بسی تھی
کیا اچھوں کی صحبت نے مجھے پاک
وگرنہ میں وہی ہوں خاک کی خاک

خودفراموشی

اتفاقات کے دھارے پلٹ آئے ہیں یہاں
کتنے ہی موسمِ گل کتنی ہی برسات لیے
سامنے ہے اسی محبوب دل آرا کا حرم
جس کے ذروں میں مہکتی ہوئی تنویریں ہیں
جس کے دیوار و در و طاق ہیں سب سے یکتا
جس کے جلووں میں چمکتی ہوئی تقدیریں ہیں
میری تقدیر بھی وابستہ و پیوستہ رہی
اسی در سے اسی زنگارِ طرب سے برسوں
غمِ دوراں سے گریزاں غمِ ہستی سے نہاں
خودفراموش رہا ہوں اسی ڈھب سے برسوں

حسنِ کلام

ہر امید و خوفِ فردوس و جہنم چھوڑ دے
کر رضائے دوست فکرِ شادی و غم چھوڑ دے

دو جہاں دے کر بھی مل جائے اگر دیدارِ دوست
پھر تقاضائے محبت ہے دو عالم چھوڑ دے

درہم و برہم سی شیرازۂ امن و سکوں
زلفِ برہم کو مری جاں اور برہم چھوڑ دے

زندگی کے عیش و غم ہیں امتیازاتِ نگاہ
سازِ عشرت چھیڑ دے افسانۂ غم چھوڑ دے

فکرِ بیش و کم بھی غم ہے دشمنِ جان و سکون
ہو سکے تو فکر ہائے بیش اور کم چھوڑ دے

شکوہ بے حاصل گلہ بے فائدہ ان کے حضور
دل خیالِ شکوہ ہائے جورِ پیہم چھوڑ دے

دولتِ فقر و غنا کیا ہے متاعِ لازوال
دھوپ چھاؤں ہے شکوہ و شوکتِ جم چھوڑ دے

دوست اب تک آ رہے ہیں زخمِ کاری کے مزے
سعیِ تسکیں چھوڑ دے غم ہائے مرہم چھوڑ دے

دیدۂ پرنم تجھے اب لے کے ڈوبے گا سلیم
بھول جا رنجِ فراواں چشمِ پرنم چھوڑ دے

☆☆☆

حرف ہائے گفتنی

حرفِ تقدیر کبھی یوں بھی مٹا ہے اے دوست
آہ بھرتے ہوئے کیوں محوِ دعا ہے اے دوست

میں بھی کہتا ہوں کہ دنیا میں کوئی غم نہ رہے
کوئی دنیا میں مگر غم سے بچا ہے اے دوست

ہر طرف مائلِ صد مکر و ریا ہے انساں
ہر قدم سلسلۂ مکر و ریا ہے اے دوست

سخت دشوار ہے جینا یہ تو مانا لیکن
موت سے پہلے ہی مرنا بھی برا ہے اے دوست

کیا بجز مرگ کوئی چین نہیں مل سکتا؟
کیا فقط موت ہی ہر غم کی دوا ہے اے دوست؟

وہی اربابِ ستم اور وہی جور و جفا
وہی ہر سمت بپا کرب و بلا ہے اے دوست

وہی دکھ درد وہی غم وہی صدمے وہی کرب
جاں کنی میں وہی مخلوقِ خدا ہے اے دوست

پابجولان ہے اب تک بھی ستم کش مزدور
آج بھی کشتۂ صد جور و جفا ہے اے دوست
غم نہ کر مٹ کے رہیں گے یہ فلک بوس محل
رنگ لانے کو ہی خونِ شہدا ہے اے دوست
کس قدر سوز سے معمور ہے ہر شعر سلیم
کیوں نہ ہو درد بھرے دل کی صدا ہے اے دوست

شانِ عجم نہ کر قبول

دستِ طلب نہ کر دراز جاہ و حشم نہ کر قبول
بن نہ گدائے روسیاہ دام و درم نہ کر قبول
تجھ پہ رہے یہ آشکار پست نہ ہو ترا وقار
جو تجھے مانگ کر ملے ناز و نعم نہ کر قبول
خود نہ لٹا سکے اگر گوہر و لعل و سیم و زر
ننگِ خودی ہے بخششِ اہلِ کرم نہ کر قبول
شکوہِ جورِ بیکراں کر نہ کبھی یہاں وہاں
بن کے حریفِ آسماں سوزشِ غم نہ کر قبول
زیست ہے کتنی مختصر وقفِ بہارِ غم نہ کر
لذتِ صبحِ عیش اٹھا شامِ الم نہ کر قبول
عظمتِ فقر پر نثار شان و شکوہِ قیصری
چھن لے عرب کی سادگی شانِ عجم نہ کر قبول
دل میں خیالِ ماورا دیکھ سلیم آ نہ جائے
تو ہے خدا پرست اگر عشقِ صنم نہ کر قبول

☆☆☆☆

حدیثِ عمر

نہ پوچھ ہم سے کہ کس طرح سے گذاری عمر
غموں کی آگ میں جلتے رہے ہیں ساری عمر
مری د ا کہ مجھے ہو سکونِ مرگ نصیب
تری دعا ہے کہ مل جائے مجھ کو بھاری عمر
مجھے قبول ہے بے لطفیٔ حیات مگر
کٹے گی کیسے مسرت سے جب ہے عاری عمر
تری ہی یاد میں کاٹے ہیں دن جوانی کے
تری ہی یاد میں کٹ جائے گی ہماری عمر
انھیں وفا سے غرض ہو نہ ہو مگر ہم نے
گذار دی ہے بقیدِ وفا شعاری عمر
ہر ایک زخم محبت میں بن گیا ناسور
مگر کٹی نہ بفریاد و آہ و زاری عمر
جھلک دکھا کے جوانی تو ہو گئی روپوش
اب ایک یادِ جوانی ہے اور ساری عمر

☆☆☆

فغانِ خاموش

ہر خموشی ہے فغاں ضبطِ فغاں کے ساتھ ساتھ
سوز بانیں ہیں زبانِ بے زباں کے ساتھ ساتھ

چار دن بے فکر و اندیشہ نہ گذرے ہم نشیں
موت کا کھٹکا رہا عمرِ رواں کے ساتھ ساتھ

رفتہ رفتہ ایک دن طے ہو ہی جائے گا سفر
چل رہے ہیں زندگی کے کارواں کے ساتھ ساتھ

دکھ اٹھا کر بھی کسی کو دکھ نہ پہنچایا مگر
لاکھ دشمن ہیں ہجومِ دوستاں کے ساتھ ساتھ

ہر قدم اپنی روش اپنا طریق اپنا خیال
اپنی دنیا میں رہے ہم اس جہاں کے ساتھ ساتھ

بے سبب چھیڑی نہیں ہم نے جہاں کی داستاں
رازِ دل کہتے رہے ہیں دوستاں کے ساتھ ساتھ

تیرے آنے سے مسرت اشکِ غم میں ڈھل گئی
ہے تبسم بھی مرے اشکِ رواں کے ساتھ ساتھ

ہم بہارِ بے خزاں کی جستجو میں ہیں سلیم
ہم نہ بدلیں گے فضائے گلستاں کے ساتھ ساتھ

(یہ غزل آل انڈیا ریڈیو لاہور کے
مشاعرہ 1945 میں پڑھی گئی)

تیر و نشتر

سعیِ سکوں سے درد فراواں نہ ہو کہیں
یوں تلخیٔ حیات نمایاں نہ ہو کہیں
سمجھے ہوئے ہیں ہم جسے صحرائے بیکراں
وہ بھی بقدرِ وسعتِ زنداں نہ ہو کہیں
رگ رگ میں ایک آگ سی بھڑکی ہوئی ہے آج
پھر مہربانیٔ غمِ جاناں نہ ہو کہیں
یا یہ بہارِ لالہ و گل جاوداں رہے
یا یہ چمن نہ ہو یہ بہاراں نہ ہو کہیں
عشقِ بتاں ہے کفر تو پھر کفر ہی سہی
لیکن یہ کفر حاصلِ ایماں نہ ہو کہیں
پھر عیشِ بے حساب میں کھوئے ہوئے ہیں ہم
پھر دردِ بے پناہ کا ساماں نہ ہو کہیں
کر تو رہے ہو شکوۂ دوراں مگر سلیم
ڈر ہے کہ بارِ خاطرِ جاناں نہ ہو کہیں

رازونیاز

پھر کہیں افشائے رازِ دل کا ساماں ہو نہ جائے
نذرِ وحشت پھر کہیں جیب و گریباں ہو نہ جائے
کچھ تمھارے حسن پر تنہا مجھے حیرت نہیں
کون ہے جو تم کو دیکھے اور حیراں ہو نہ جائے
حد سے باہر ہوتی جاتی ہے کسی کی ہر جفا
ضبط سے باہر مرا حالِ پریشاں ہو نہ جائے
شرم سے سمٹی ہوئی سی ترچھی ترچھی سی نگاہ
جس نے دل لوٹا وہی غارت گرِ جاں ہو نہ جائے
بارہا کرتا ہوں ناکردہ گناہوں کو قبول
ورنہ ڈر ہے وہ جفاؤں پر پشیماں ہو نہ جائے
سوچتا رہتا ہوں غم آسان ہو جائے سلیم
پھر خیال آتا ہے ان کا غم ہے آساں ہو نہ جائے

روودادِ غم

اب کسی سے کیا کہیں اپنے جنوں کی داستاں
دل کے پرورده تمناؤں کے خوں کی داستاں
لب پہ آہیں زرد سا چہرہ نگاہیں غم زدہ
اپنی صورت بن گئی رنجِ فزوں کی داستاں
آپ مت سنئے گا ہم سے بھول کر روودادِ غم
سن کے کیا کیجیے گا اک خوار و زبوں کی داستاں
ایک کی خاطر زمانے سے تعلق توڑنا
کس قدر دلچسپ ہے اہلِ جنوں کی داستاں
لوٹ لی انسان نے انسانیت کی آبرو
ورنہ انسانی لبوں پر کشت و خوں کی داستاں؟
میری آنکھوں سے عیاں ہو ہی گئے آثارِ غم
اف بیاں ہو ہی گئی سوزِ دروں کی داستان
عمر بھر لوٹے ہوں جس نے بے قراری کے مزے
اس سے کیا پوچھے کوئی دل کے سکوں کی داستاں
اب تو بیزاری ہی بیزاری ہے دنیائے سلیم
بس بھی کر جانے بھی دے دنیائے دوں کی داستاں

سوز و ساز

رکھا نہ کہیں کا ہمیں بے راہ روی نے
مرنے کے سلیقے ہیں نہ جینے کے قرینے
اف بحرِ محبت کی وہ طغیانیِ پیہم
صد شکر کہ ڈوبے نہ محبت کے سفینے
کچھ کوششِ درماں سے ہوئی اور خرابی
کچھ اور بگاڑا ہے غمِ چارہ گری نے
کچھ سعیِ محبت میں ہوئے اور بھی ناکام
کچھ اور دیے رنج مسرت طلبی نے
اللہ رے افزونیِ وحشت کا وہ عالم
جس سمت نظر کی ہے پکارا ہے کسی نے
ہر گام پہ سو چال ہر اک چال میں الجھن
لوٹا ہے زمانے کو تری راہبری نے
کچھ اور بھی آئے وہ سلیم آج سوا یاد
چھیڑا ہے جو غنچوں کو نسیمِ سحری نے

خیالِ دوست

پھر آ گئی بہار مہک اٹھے باغ و راغ
پھر ہیں شمیمِ گل سے معطر دل و دماغ
کر زندگی خراب تجسس نہ ہم نشیں
جب اپنے ہست و بود کا ملتا نہیں سراغ
کیا دیکھتے ہی دل میں مسرت ہے موجزن
گل ہیں چمن میں یا کہ چھلکتے ہوئے ایاغ
مجبوریاں ہیں ساتھ وگرنہ مرے حبیب
دل کی خوشی کہاں کہ خوشی سے اٹھائے داغ
ہم ہیں سلیم اور کسی کا خیال ہے
کچھ اور سوچنے کے لیے ہے کہاں فراغ

قطعات

آسمانوں میں جس طرح بادل
اڑتے اڑتے فضا میں کھو جائیں
لے کے تخئیل کا سہارا ہم
کاش دنیا سے دور ہو جائیں
زہر غم پی رہے ہیں اور خوش ہیں
دل نے دیکھا نہیں خوشی کا لطف
جانے کیوں پھر بھی زندگی ہے عزیز
ہے عجب طرفہ زندگی کا لطف

☆☆☆

شکر صد شکر کسی کا میں نہیں ہوں استاد
ورنہ استاد بھی بننے کا مجھے ہوتا خبط
اسی الجھن میں شب و روز الجھتا رہتا
کہ کسی طرح سے استادوں سے ہوجائے ربط

☆☆☆

جائے عبرت ہے بزمِ شعر و سخن
شعریت کی ہے روح فریادی
شعر کہنا جنھیں نہیں آتا
وہ بھی رکھتے ہیں خبطِ استادی

☆☆☆

یاد بن کر دلوں میں ہے پنہاں
کون کہتا ہے مر گیا اقبال
یاد کرتے رہیں گے لوگ اسے
اور گذرتے رہیں گے ماہ و سال

☆☆☆

جہانِ شوق

عجب کارنمایاں کرتے جاتے ہیں جہاں والے
نہ جانے دل میں کیا کیا کہہ رہے ہیں آسماں والے
ادھر ہم ہیں قفس ہے اور یادِ آشیانہ ہے
ادھر بجلی کے ڈر سے دم بخود ہیں آشیاں والے
خوشی فانی ہے غم فانی ہے تم فانی ہو ہم فانی
جہاں میں مل نہیں سکتے جہانِ جاوداں والے
نہ جانے کب کہاں کیسے پہنچ جائیں گے منزل پر
بہر صورت رواں ہیں زندگی کے کارواں والے
یہ اہل فن کی بے قدری یہ نا اہلوں کی سرداری
ہنر والے نہ مٹ جائیں کہیں سے لامکاں والے
سلیم اب اہلِ دل کب تک بچائے جائیں دل اپنا
جہاں دیکھو وہیں ملتے ہیں حسنِ دل ستاں والے

☆☆☆

تم کو سونے میں تولتا کیسے
میں کہ تھا ایک شاعرِ قلاش
آج تم مجھ سے دور ہو اے دوست
جرمِ افلاس کی ہے یہ پاداش

بہاروخزاں

رونقِ صد بہار کھو بیٹھے
دولتِ وصلِ یار کھو بیٹھے
آج پھر جانے کتنے لعل و گہر
دیدۂ اشک بار کھو بیٹھے
دامنِ تار تار بھی نہ رہا
دامنِ تار تار کھو بیٹھے
بعد مدت ملی مسرتِ زیست
وہ بھی بے اختیار کھو بیٹھے
یوں خزاں کا سلیم دور چلا
ہم امیدِ بہار کھو بیٹھے

☆☆☆

لالہ زار

رونقِ لالہ زار کیا کہیے
آمدِ نو بہار کیا کہیے
گلستاں موتیوں سے ہو معمور
ہلکی ہلکی پھوار کیا کہیے
غم نے بھی دل کا ساتھ چھوڑ دیا
حالتِ قلبِ زار کیا کہیے
یہ لبِ جو یہ چاندنی راتیں
یہ گلوں کا نکھار کیا کہیے
اب ہنسی پردہ دارِ غم نہ رہی
اے دلِ سوگوار کیا کہیے
لاکھ وعدوں کے ٹوٹنے پر بھی
حسن کا اعتبار کیا کہیے
جبر ہی جبر سہہ رہے ہیں سلیم
تہمتِ اختیار کیا کہیے

☆☆☆

کیا ہم کریں

زندگانی بجز غم ہے کیا علاجِ غم کریں
اس خدائی جبر پر کیا تم کرو کیا ہم کریں

ہیں یہ سب شکوے گلے جوشِ محبت ہی کے ساتھ
کم محبت ہو تو ہم تیری شکایت کیا کریں

جب کسی شے سے مسرت ہو نہیں سکتی ہمیں
تو خوشی سے کیوں نہ ہم پیدا ہزاروں غم کریں

آپ ہی کی بخششیں ہیں سب جراحت ہائے دل
آپ ہی اب کچھ علاجِ زخمِ بے مرہم کریں

درہم و برہم سہی شیرازۂ امن و سکوں
گیسوئے برہم کو وہ کچھ اور بھی برہم کریں

آ کہ پھر برپا کریں بزمِ نشاط و سرخوشی
آ کہ اپنے قہقہوں کو پردہ دارِ غم کریں

جب محبت میں خود اپنے آپ پر آتا ہو رشک
تو کسے اے دوست تیرے راز کا محرم کریں

کیوں نہ اک بجلی گری اپنے نشیمن پر سلیم
لٹ چکا یہ گھر بہت اس گھر کا کیا ماتم کریں

☆☆☆

لعل و گوہر

ٹوٹتے ہیں لعل و گوہر چشمِ تر سے بار بار
یوں گذرتے ہیں کسی کی رہگذر سے بار بار
مٹنے والے ہی نہیں اپنے مقدر کے حروف
ورنہ اشکِ غم بہائے چشمِ تر سے بار بار
باربار ہوتی رہی دنیائے دل زیر و زبر
اس نے دیکھا ہے نگاہِ فتنہ گر سے بار بار
ہوش کی حالت میں پہنچے ہیں ترے در تک مگر
بے خبر ہو کر اٹھے ہیں تیرے در سے بار بار
خود بخود جب دل سے مٹ جاتا ہے ناکامی کا غم
ایسے عالم بھی گذرتے ہیں نظر سے بار بار
ذرّے ذرّے میں کسی کے جلوے پنہاں ہیں سلیم
دیکھتا ہوں دل کی چشمِ معتبر سے بار بار

☆☆☆

کیفیات

میں جب حد سے زیادہ سرخوشی محسوس کرتا ہوں
تو ہمدم اپنی آنکھوں میں نمی محسوس کرتا ہوں
خلش رگ رگ میں دل میں بیکلی محسوس کرتا ہوں
میں جب خود میں محبت کی کمی محسوس کرتا ہوں
یہ تنہائی، اداسی اور یہ بے چارگی توبہ
الٰہی آج کتنی بے کسی محسوس کرتا ہوں
پھر ان کے آستاں پر جبہ سائی کر رہا ہوں میں
پھر اپنی زندگی کو زندگی محسوس کرتا ہوں
کسی کی خشمگیں نظروں میں کیسا انقلاب آیا
کہ ان نظروں میں اک دنیا نئی محسوس کرتا ہوں
دلِ غمگیں نے چھیڑے ہیں کچھ ایسے درد کے نغمے
کہ ہر ذرہ کی آنکھوں میں نمی محسوس کرتا ہوں
کوئی حد ہی نہیں ہے رنج و غم کی لیکن اے ہمدم
تم آئے ہو تو کچھ تسکین سی محسوس کرتا ہوں

انہی ناکامیوں میں کامیابی دیکھتا ہوں میں

انہی تاریکیوں میں روشنی محسوس کرتا ہوں

محبت میں یہ پیہم بدگمانی بھی قیامت ہے

کہ ان کے لطف کو بھی بے رخی محسوس کرتا ہوں

کسی صورت خلش مٹتی نہیں دردِ محبت کی

کبھی محسوس ہوتی ہے، کبھی محسوس کرتا ہوں

تصور میں سلیم اس در پہ سجدے کر رہا ہوں میں

جدائی میں بھی ان کو پاس ہی محسوس کرتا ہوں

آہ وفغاں

آشیانے کے مقابل آشیاں سے دور بھی
بجلیاں ہیں گلستاں میں گلستان سے دور بھی
ایک ہی حسنِ حقیقت ہے یہاں ہو یا وہاں
عالم ہستی میں بھی کون و مکاں سے دور بھی
منحصر ہے جذبۂ بے اختیارِ شوق پر
یعنی منزل پاس بھی ہے کارواں سے دور بھی
وہ جہاں بھی ہوں وہیں پر سجدہ ہائے شوق کر
آستانے سے قریب اور آستاں سے دور بھی
یوں قفس کو گلستاں میں رکھ دیا صیاد نے
گلستاں میں بھی رہے ہم گلستاں سے دور بھی
پے بہ پے صدمے اٹھا کر زندگانی میں سلیمؔ
کوئی رہ سکتا ہے کیا آہ و فغاں سے دور بھی

زیروبم

اے دلِ آزردہ ترکِ غم بھی ہو جائے کبھی
اختتامِ فکرِ بیش وکم بھی ہو جائے کبھی
ایک ہی سر میں سرودِ زندگی گا کر نہ دیکھ
نغمۂ ہستی میں زیر و بم بھی ہو جائے کبھی
اف سکوتِ مستقل ہر آرزو کے خون پر
یہ خموشی تا بکے، ماتم بھی ہو جائے کبھی
چھوڑ کر ذکرِ تبسم ہائے گل ہائے چمن
کوئی ذکرِ گریۂ شبنم بھی ہو جائے کبھی
دل نے ہنس ہنس کر اٹھائے ہیں بہت رنج و الم
رنج بھی کیا ہے جو غم کا رنج ہو جائے کبھی
خوب ہے بے غم سے رہنا زندگانی میں سلیم
خوب تر ہے چشم اگر پُرنم بھی ہو جائے کبھی

جلوہِ زار

کسی کو اپنے دل میں جلوہ آرا کرلیا ہم نے
رواں رگ رگ میں اک برقِ تجلّی کرلیا ہم نے

خوشا قسمت کہ جب سے ان کو اپنا کرلیا ہم نے
زمانے کا کوئی غم ہو گوارا کر لیا ہم نے

بہت روکا ہمیں خود داریوں نے پھر بھی کیا کہیے
ترے جلوؤں کو دیکھا اور سجدہ کرلیا ہم نے

محبت کی یہ مجبوری یہ لا چاری ارے توبہ
کہ خود اپنی تباہی کا نظارا کرلیا ہم نے

کسی کی یاد جب آئی سلیم آنسو امنڈ آئے
رواں جلتی ہوئی آنکھوں سے دریا کرلیا ہم نے

کیا کیا کریں

دیکھ لی دنیائے فانی فکرِ دنیا کیا کریں
تا بکے مہماں سرا کو اپنا گھر سمجھا کریں

آہ کو دل میں دبائیں اشک کو روکا کریں
تم ہی سمجھاؤ جنونِ غم میں ہم کیا کیا کریں

بزمِ مے نوشی میں رقصاں ساغر و مینا کریں
آ کہ ہستی کا ہر اک لمحہ طرب افزا کریں

زندگیِ جاوداں ہم بھی مگر پیدا کریں
تا ابد اے جانِ جاں تیرا ہی نظارا کریں

ہر قدم پر اک جہانِ بے بسی دیکھا کریں
پھر بھی فرماں ہے نہ تڑپیں اور نہ تڑپایا کریں

کیا یہی ہے زندگی اے خالقِ جاں آفریں
چند لمحے مسکرائیں مدتوں تڑپا کریں

تیری رسوائی بھی جب اپنی ہی رسوائی ہے دوست
ہم تو رسوا ہو چکے اب تجھ کو رسوا کیا کریں

کیوں نہ زنداں میں رہیں محوِ خیالِ کوہ دشت
کیوں نہ ہم وحشت زدہ زندان کو صحرا کریں

موت آئے گی تو ہم لبیک کہہ دیں گے سلیم
کس لیے مرگ سکوں پرور سے گھبرایا کریں

عرفانِ حال

شاکی قربت کبھی ہم سوختہ ساماں نہیں
گو سراپا درد ہیں منتِ کشِ درماں نہیں
آج اہلِ دل کی ہمت آزمائی جائے گی
سامنے طوفاں ہے اور اندازۂ طوفاں نہیں
جان کر بھی عشق میں کھانا ہی پڑتا ہے فریب
تو ہمیں ناداں سمجھتا ہے کوئی ناداں نہیں
کس غضب کی ڈالدیں اے دوست تو نے الجھنیں
زندگی آساں نہیں تو موت بھی آساں نہیں
دامنِ مژگاں میں تو نے کیا چھپا رکھا ہے دوست
دل میں اک پیکاں سا چبھتا ہے مگر پیکاں نہیں
آ سلیمؔ غمزدہ تجدیدِ مے نوشی کریں
جز شرابِ تلخ علاجِ تلخیِ دوراں نہیں

☆☆☆

طوفانِ درد

درد کم ہے یادِ جاناں کو نہ جانے کیا ہوا
لذتِ رنجِ فراواں کو نہ جانے کیا ہوا
پھیکی پھیکی چاندنی افسردہ افسردہ چمن
گلستاں کو، ماہِ تاباں کو نہ جانے کیا ہوا
اب وہ آئے ہیں تو آنکھوں میں اک آنسو بھی نہیں
آج اشکِ غم کے طوفاں کو نہ جانے کیا ہوا
وہ تغافل کوش اور آمادۂ لطف و کرم!
بیٹھے بیٹھے دشمنِ جاں کو نہ جانے کیا ہوا
وہ در و دیوارِ زنداں کو گرانے کا جنوں
اف جنونِ اہلِ زنداں کو نہ جانے کیا ہوا
دستِ انسانی حنائی خونِ انسانی سے ہے
بدتر از حیواں ہے انساں کو نہ جانے کیا ہوا
توڑ ڈالا ضبط کا ہر سلسلہ دل نے سلیم
فرطِ غم سے آہ ناداں کو نہ جانے کیا ہوا

☆☆☆

کوشش پیہم

تو ہی پابندِ نگاہِ امتیاز آلود ہے
ایک ہی ورنہ شہود و شاہد و مشہود ہے
حد سے باہر کیوں ہوئی جاتی ہے ان کی ہر جفا
کیا ہمارے ضبطِ غم کا امتحاں مقصود ہے
غم نے کس صورت سے دل میں آگ بھڑکائی ہے دوست
آج اپنا ہر نفس اک شعلۂ بے دود ہے
کوشش ِ پیہم سے ہی ہوتا ہے انساں کامیاب
کچھ مصائب ہیں مگر پھر منزلِ مقصود ہے
عشق ہی ہے رہنمائے شاہراہِ زندگی
عشق ہی سے روشنی بزمِ ہست و بود ہے
پہلے تو خود بھی ہو اخلاص و وفا سے آشنا
پھر یہ کہنا مجھ میں اخلاص و وفا نابود ہے
زندگانی ایک مدت سے ہے وقفِ غم سلیم
راحتِ ہستی کا مجھ تک راستہ مسدود ہے

☆☆☆

شکوہ وشکایت

زندگی بے کیف سی ہے یادِ جاناں کی قسم
دل پریشاں ہے بہت زلفِ پریشاں کی قسم
کس کو ساحل کی تمنا کس کو ساحل کی تلاش
ہم کو ملتا ہے سکوں طوفاں میں طوفاں کی قسم
تو ہے میرے گلستانِ زندگانی کی بہار
تو ہی میری جاں ہے میری جاں تری جاں کی قسم
اک معمہ ہے ابھی تک ہمنشیں مرگ و حیات
آدمی اب تک ہے جاہل علم و عرفاں کی قسم
گریۂ شبنم سے ہے افزونیِ حسنِ چمن
خندۂ گل کی قسم گل ہائے خنداں کی قسم
آدمی ہے وجہِ ننگِ آدمیت آج کل
آدمیت کی قسم ناموسِ انساں کی قسم
بے قراریِ محبت روز افزوں ہے سلیم
حسنِ جاناں کی قسم عشقِ فراواں کی قسم

☆☆☆

صبحِ شامِ الم

کبھی ہیں گریاں کبھی ہیں خنداں کبھی ہے غم تو کبھی خوشی بھی
ہزار رنگوں میں رنگِ دنیا ہے زندگی کی ہما ہمی بھی
کچھ اس طرح سے گذر رہی ہے کچھ اس طرح سے گذر گئی بھی
کہ ہم نے رو رو کے شام کر دی جو صبحِ شامِ الم ہوئی بھی
وہ آج اس طرح یاد آئے کہ دل کو غم بھی ہے اور خوشی بھی
کرم بھی یاد آ رہے ہیں ان کے نظر میں ہے ان کی برہمی بھی
ثبات غم کو نہیں میسر تو عارضی ہے شگفتگی بھی
ہمیشہ باقی نہیں رہیں گے مرا الم بھی تری خوشی بھی
ہیں جتنے خم سب کے سب پلا دے شراب خانے میں مے بہا دے
جب آج پینے پہ آ گئے ہیں تو کیوں نہ پی لیں رہی سہی بھی
بچھڑ گئے جب تو یاد آیا بچھڑ ہی جانا تھا ہم کو اک دن
ہم اس طرح سے جدا بھی ہوں گے یہ دل نے سوچا نہ تھا کبھی بھی
وہی ہیں جانِ قرار و تسکیں جنھوں نے صبر و قرار لوٹا
غمِ محبت تری دہائی کہ رہزنی بھی ہے رہبری بھی
حدودِ منزل سے بڑھ گئے ہیں خیالِ منزل میں بار ہا ہم
سلیمِ منزل بکف رہی ہے ہماری ہر ایک گمرہی بھی

احساسات

بہ جبر لب پہ جب آئے ہنسی، ہنسی تو نہیں
کمالِ سعیِ مسرت شگفتگی تو نہیں
وہ عرضِ حال پہ ان کا خموش رہ جانا
کرم نہیں ہے نہ ہو کوئی بے رخی تو نہیں
خوشی خوشی سے ترا غم کیا ہے ہم نے قبول
وگرنہ عیش و مسرت کی کچھ کمی تو نہیں
سنبھل سنبھل نہ محبت کو اک مذاق بنا
یہ نقدِ جان کی بازی ہے دل لگی تو نہیں
اگر یقیں ہو تو بگڑی سنور بھی سکتی ہے
خدا کی مار ہے لیکن یقین ہی تو نہیں
ترے بغیر بھی گل مسکرا رہے ہیں مگر
وہ دلکشی تو نہیں ہے وہ تازگی تو نہیں
ہوا ہوں تجھ کو بھلانے پہ آج آمادہ
مرے جنوں کی کہیں حدِّ آخری تو نہیں
جبینِ شوق جھکانا کسی کے در پہ سلیم
لوازماتِ محبت فقط یہی تو نہیں

کیف وسرور

قفس میں بادِ صبا گلستاں سے آتی ہے
جہاں لٹا تھا نشیمن وہاں سے آتی ہے
عجیب شانِ قیامت نشاں سے آتی ہے
یہ برق کیا کہیں کوئے بتاں سے آتی ہے
ہر اک جفا پہ وفا کا گماں سا ہوتا ہے
کہ بوئے مہر سی نا مہرباں سے آتی ہے
چمن میں شاخِ نشیمن کی خیر ہو یارب
تڑپ کے برقِ تپاں آسماں سے آتی ہے
یہی جو تلخیِ شیریں تمھارے غم میں ہے
مرے حبیب یہ لذت کہاں سے آتی ہے
بچھڑ گیا ہے کوئی کاروانِ زیست سے کیا
یہ کیوں صدائے فغاں کارواں سے آتی ہے
سلیم کھل نہ سکا آج تک محبت میں
جفائیں سہنے کی طاقت کہاں سے آتی ہے

☆☆☆

وہم و حقیقت

دلفریب تھی کتنی دشمنوں کی عیاری
بارہا چبھی دل میں دوستوں کی غم خواری
کب تک اے ریاکارو! اعتمادِ مکاری
چاک ہو ہی جاتا ہے پردۂ ریاکاری
انتہائے نغمہ ہے انتہائے خمیازہ
اے ستم گرو روکو شغلِ مردم آزاری
بارہا محبت میں وہم کا گماں گذرا
بارہا حقیقت کو سمجھے خوابِ بیداری
اک نہ اک نیا نشتر بات بات میں پنہاں
پھر بھی ہے حسینوں کو ادعائے دلداری
ان خنک ہواؤں میں مس ہے تیرے ہاتھوں کا
تیری سرد گفتاری تیری برق رفتاری
آج جلتی آنکھوں میں شعلے سے بھڑکتے ہیں
تو ہے یا ہے آنکھوں میں عکسِ گل کی گلکاری

تبدیلی

سیم و زر نے تجھے بدل ڈالا
مجھ کو بھولا مری وفا کو بھی
تجھ سے کیا ہو گلہ جب اہلِ زر
بھول جاتے ہیں یوں خدا کو بھی

☆☆☆

یاد

میں نے جب بھی خوشی کے گائے گیت
میرے نغموں میں ڈھل گئی فریاد
آہ اے دوست بھولنے پر بھی
دل سے مٹتی نہیں ہے تیری یاد

☆☆☆

رات کی خاموشیوں میں دور تا حدِ نظر
اس طرح تھم تھم کے کوئی رو رہا ہے بار بار
جس طرح رک رک کے آنکھوں سے بہیں قطراتِ اشک
جس طرح تھم تھم کے دل میں ٹیس اٹھے بے اختیار

☆☆☆

سازِ غزل

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

بہت ہی لطف ہمیں شام انتظار آیا
نہ تم ہی آئے نہ دل کو کوئی قرار آیا

خزاں نصیب تھے جب وقت سازگار آیا
ادھر وہ آئے ادھر موسم بہار آیا

کمال جذب محبت بروئے کار آیا
مرے سکوں کے لیے کوئی بے قرار آیا

تری تلاش کی دھن اور جنون کا عالم
خدا ہی جانے کہاں تک تجھے پکار آیا

پئے سکون غم دل کسی کی محفل میں
بحال زار گیا اور بحال زار آیا

سمجھ رہا تھا اسے بھول ہی گیا ہوگا
کہ دفعتہً مرے دل کو خیال یار آیا

اف اضطراب کا عالم کہ تیرے کوچے میں
ہزار بار گیا اور ہزار بار آیا

ہزار ادائیں ہر اک دلنشیں و مہر آگیں
بتائیں کیا ہمیں کس کس ادا پہ پیار آیا

یہ کس کا پاسِ ادب تھا کہ مجھ سا رندِ خراب
پئے ہوئے بھی سرِ بزم ہوشیار آیا

اٹھ اور جام پلا ساز اٹھا، ترانہ گا
ترا سلیم ترا رندِ جاں نثار آیا

☆☆☆

محبت میں وفا میں خوب ہے جی سے گذر جانا
یہاں ہستی مٹا دینا ہے ہستی کا سنور جانا

جنوں کی دھن میں ہر پتھر کو ہم نے سنگ در جانا
کوئی بھی رہ گذر ہو ہم نے تیری رہگذر جانا

بہت ڈھونڈھا خلوص دوستی اے وائے ناکامی
جسے بھی دوست سمجھا آخرش بیدادگر جانا

وہی سب سے زیادہ حال دل سے بے خبر نکلے
جنھیں سب سے زیادہ حال دل سے باخبر جانا

مری مجبوریاں لاچاریاں کچھ بھی سہی لیکن
قیامت ہے ترے دامن پہ اشکوں کا بکھر جانا

یہاں میں نے محبت کے، وفا کے گیت گائے ہیں
ذرا سا ہو سکے تو قافلے والو ٹھہر جانا

ترے آنے سے کیا کیا میکدے پر رونقیں برسیں
تماشا کردنی تھا ذرے ذرے کا بکھر جانا

سلیم اک عمر گذری ہے بیان آرزو کرتے
یہ قصہ کتنا طولانی تھا لیکن مختصر جانا

☆☆☆

چشمِ تر سے سیلِ اشکِ غم رواں ہوتا رہا
ماجرائے دردِ بے پایاں بیاں ہوتا رہا
زندگی بھر وہ رہے آمادۂ جور و ستم
عمر بھر میری وفا کا امتحاں ہوتا رہا
چرخِ کجرو کے ستم سے ہم نہ گھبرائے مگر
تو شریکِ فتنہ ہائے آسماں ہوتا رہا
بارہا حرفِ تمنا لب پہ آ کر رہ گیا
اک سکوتِ شوقِ دل کا ترجماں ہوتا رہا
اللہ اللہ تیرے غم کی آرزو انگیزیاں
غم مٹا دل سے تو احساسِ زیاں ہوتا رہا
ہم نے جی بھر کر نہ لوٹا لطفِ فصلِ گل سلیم
گلستاں کو دیکھ کر بیمِ خزاں ہوتا رہا

☆☆☆

پھر وہی بانیِ بے دادِ جفا یاد آیا
دل میں وہ درد سا اٹھا کہ خدا یاد آیا
دل نے پھر چھیڑ دیے عشق و وفا کے قصے
پھر وہی دشمنِ اربابِ وفا یاد آیا
ہم نے چاہا نہ چلیں تیرے اشاروں پہ مگر
دفعتاً شیوۂ تسلیم و رضا یاد آیا
میں بھی پیمانِ وفا توڑ ہی دیتا تجھ سے
لیکن اے دوست ترا عہدِ وفا یاد آیا
اب کہاں ضبط کہ ہے وقت وداعِ تسکیں
اب کہاں ہوش کہ پھر ہوش ربا یاد آیا
پھر جبیں میں خلشِ سجدۂ بے لوث ہوئی
پھر سلیم آج وہ نقشِ کفِ پا یاد آیا

کتنے ہنستے لوگوں کو دل دکھا ہوا پایا
بے نیازِ غم کو بھی غم سے آشنا پایا
برق پا جوانی تھی زندگی بھی فانی تھی
پھر بھی تیری چاہت میں لطفِ بے بہا پایا
ہر خوشی تھی رنج آمیز عشرتیں تھیں غم انگیز
ہم نے ہر مسرت کو سایۂ ہما پایا
رنگ رنگ کے جلوے اور اپنی محرومی
اے خدائے محبوبی ہم نے تجھ سے کیا پایا
کس کو تھی محبت میں فکرِ جادۂ منزل
رک گئے جہاں تیرا ہم نے نقشِ پا پایا
با رہا خموشی میں ڈھل گئی فغاں اپنی
دل کی دھڑکنوں کو بھی سازِ بے صدا پایا
کس کو تھی محبت میں فکرِ جادہ ومنزل
مرگ کے جہاں میں بھی تیرا نقشِ پا پایا
حوصلہ شکن بھی تھا بے وفائیوں کا غم
شوقِ بیکراں کو بھی ہمت آزما پایا
بے بسی سلیم اپنی اور بھی ابھر آئی
ہم نے جورِ خوباں کو جب وفا نما پایا

خدا ہی جانے کہ آخر مآل کیا ہوگا
خرابِ دردِ محبت کا حال کیا ہوگا

تری بلا سے اگر مٹتے جا رہے ہیں ہم
ہمارے مٹنے سے تجھ کو ملال کیا ہوگا

ہر ایک یاس ہے پیغامِ صد ہزار امید
ہجومِ یاس سے دل پائمال کیا ہوگا

جہاں ہے جلوۂ زیرِ نقاب ہی سے خراب
نقاب اٹھی تو زمانے کا حال کیا ہوگا

نظر سے ہو نہ اگر کارِ ترجمانیٔ شوق
تو پھر زباں سے بیاں دل کا حال کیا ہوگا

کسی سے کر نہ سکے ہم کبھی سوالِ کرم
سلیم حشر میں ہم سے سوال کیا ہوگا

جانے کس کے اشکِ غم ہیں ان ستاروں پر نہ جا
جانے کس کے داغِ دل ہیں لالہ زاروں پر نہ جا

دو گھڑی کی تازگی پھر دائمی افسردگی
غنچہ و گل کے تبسم کے نکھاروں پر نہ جا

چہرۂ گل پر ہجومِ اشکِ شبنم بھی تو دیکھ
اہلِ غم پر کر نظر عشرت کے ماروں پر نہ جا

حاصلِ فصلِ بہاراں جز خزاں کچھ بھی نہیں
اس دو روزہ زندگانی کی بہاروں پر نہ جا

امتزاجِ رنگ و بو وہ بھی سراب اندر سراب
فطرتِ رنگیں کے رنگیں شاہکاروں پر نہ جا

دہر کیا ہے لغزشِ چشمِ بصیرت کے سوا
حسن بھی اک واہمہ ہے گل عذاروں پر نہ جا

جاگ خوابِ زیست سے اور زیست کی تہہ تک پہنچ
یہ بھی سوئے ہی ہوئے ہیں ہوشیاروں پر نہ جا

جھوٹی جھوٹی غمگساری جھوٹے جھوٹے غمگسار
اپنا غم رکھ اپنے دل تک غمگساروں پر نہ جا

ہو رہے گا اور بھی رسوائیوں کا سامنا
رازداں کا کیا بھروسا رازداروں پر نہ جا

کس لیے یوں محوِ رنگ و بوئے گلشن ہے سلیم
ایسے رخصت گشتنی رنگیں نظاروں پر نہ جا

☆☆☆

اے جذبۂ دل تو بھی تو کچھ کام نہ آیا
تڑپے تو بہت ہم مگر آرام نہ آیا
سو طرح سے کی غم کی شکایت مگر اے دوست
تیرا ہی ادب تھا کہ ترا نام نہ آیا
دل ہو نہ سکا مائل رنگینیٔ دنیا
یہ طائرِ ہشیار تہہِ دام نہ آیا
جب بزم میں گردش میں ہوئے جام و صراحی
پھر تذکرۂ گردشِ ایام نہ آیا

☆☆☆

سلگ سلگ کے ترے غم میں جل رہا ہوں میں
فنا کے سانچے میں چپ چاپ ڈھل رہا ہوں میں
کسے یہ ہوش کہ منزل کب آئے گی لیکن
ترے خیال میں گم ہو کے چل رہا ہوں میں
اٹھائے اب نہ کوئی زحمتِ فریبِ وفا
کہ اب فریب کی زد سے نکل رہا ہوں میں
وداعِ ہوش ہے آغازِ ہوش میرے لیے
بہ فیضِ جامِ مکرر سنبھل رہا ہوں میں
رواں ہے دیدۂ پرنم سے سیلِ اشکِ الم
مثالِ شمعِ فروزاں پگھل رہا ہوں میں
غمِ حیات کی رعنائیوں میں گم ہو کر
غمِ حبیب کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں
یہ جانتا ہوں غمِ زندگی نہ دے گا ساتھ
قدم قدم پہ مگر ساتھ چل رہا ہوں میں

☆☆☆

ساقی یہ کیا سماں ہے یہ کیا انقلاب ہے
الٹی ہے بزم الٹا ہوا آفتاب ہے
جاتی بہار کا ہے دمِ واپسیں مگر
سمجھے ہوئے ہیں ہم کہ یہ جوشِ شباب ہے
یہ لمحہ عمر بھر کے لیے نقش بن گیا
اب ان گئے دنوں کی مزین کتاب ہے
جو عیشِ رفتہ ہے، وہ ہے سرمایۂ خیال
جو یاد خوشگوار ہے تمہیدِ خواب ہے
ایک ایک دلنواز نظارہ بچھڑ گیا
اور جو نگاہ میں ہے وہ پا در رکاب ہے
ہمت اگر نہ ہو تو ہے سم ہی علاجِ غم
جامِ شراب زہر نہیں ہے شراب ہے
لازم تھا اس کو سجدۂ سہو اس جگہ سلیم
جس کا جواب یہ غزلِ لاجواب ہے

☆☆☆

کبھی حیات کا غم ہے کبھی ترا غم ہے
عجیب کشمکشِ پے بہ پے کا عالم ہے
تمھیں تجلیِ رخسار لے کے آ جاؤ
کہ آج شمعِ مسرت بہت ہی مدھم ہے
ترا خیال ابھی تک ہے مونسِ شبِ غم
کشاکشِ غمِ دوراں میں یہ بھی کیا کم ہے
سراغ منزلِ مقصود بھی نہیں ملتا
مگر یہ قافلۂ عمر مائلِ رم ہے
ازل کی صبح بھی ہے اور ابد کی شام بھی ہے
یہ زندگی کہ بہت مختصر بہت کم ہے
متاعِ ہستیِ دو روزہ آرزو تیری
وہ آرزو کہ مری زندگی میں مدغم ہے
کچھ اس میں قہرِ زمانہ کا رنگ ہے ورنہ
مزاجِ دوست نہ برہم رہا نہ برہم ہے
سلیم حسن کی چاہت کسی طرح نہ گئی
اساسِ دردِ محبت بہت ہی محکم ہے

نہ صرف سعیِ مسرت خراب ہو کے رہی
ستم تو یہ ہے کہ وجہِ عذاب ہو کے رہی
خرابِ الفتِ جاناں کچھ ایک ہم ہی نہ تھے
تمام محفلِ ہستی خراب ہو کے رہی
وہ پہلی پہلی نظر جس نے دل کو لوٹ لیا
وہی نگاہ خود اپنا جواب ہو کے رہی
کہاں کہاں تھا نگاہوں سے کوئی پوشیدہ
قدم قدم پہ نظر کامیاب ہو کے رہی
شراب بن کے رگِ تاک میں ہوئی پنہاں
گھٹا سے بوند جو ٹپکی شراب ہو کے رہی
ہزار پردہ بہ پردہ سہی تجلیٔ دوست
حجاب رہ نہ سکے بے حجاب ہو کے رہی
اٹھی تھی موجِ مسرت جو گوشۂ دل میں
ہزار حیف کہ موجِ سراب ہو کے رہی
سلیم ہم کو جہنم قبول تھا لیکن
نوازشِ کرم بے حساب ہو کے رہی

(شہباز عیدالضحیٰ نمبر 72 نومبر 1944)

شکوہ طرازیٔ ستمِ آسماں نہیں
دل پائمالِ غم سہی لب پہ فغاں نہیں
گو عرضِ حال کی مجھے تاب و تواں نہیں
تو جس کو سن سکے وہ مری داستاں نہیں
دل کا ہر ایک راز نظر سے نہاں نہیں
ورنہ تجلیٔ رخِ جاناں کہاں نہیں
دنیا میں دردِ عشق غمِ جاوداں تو ہے
مانا غمِ حیات غمِ جاوداں نہیں
ناصح جنونِ عشق میں کیا مصلحت کا دخل
اک جان کا زیاں ہے سو کوئی زیاں نہیں
رخ سے کسی نے پردۂ حائل ہٹا دیا
اب جز نگاہِ شوق کوئی درمیاں نہیں
مصروفِ سجدہ ہائے مسلسل ہے کیوں سلیم
یہ جلوہ گاہِ حشر ہے کوئے بتاں نہیں

حق بات نکالیں گے بہر حال لبوں سے
نپٹیں گے بہ ہر گام خوشامد طلبوں سے

بوسہ نہیں دیتے تو نہ دو لب کو بھی جنبش
تحریکِ تمنا تو نہ ہو ان سببوں سے

تانیث ہی تھی وجہِ کشش بنتِ عنب کی
گویا کہ ملاتے رہے لب تیرے لبوں سے

زنداں کے نگہبانوں کا تہذیب کا دعویٰ
یہ معجزہ سرزد نہ ہوا بے ادبوں سے

وہ جن کی بدولت تھی حیات آتشِ گلریز
آزردہ ہوئے ہم تو انھیں خوش لقبوں سے

دستانے پہن کر نہ مل اے دخترِ زردار
کیا ہونٹ کے بدلے ملیں لب تیرے لبوں سے

گذرے ہیں بہت پاس سے لیکن نہ ملے وہ
پیادہ بھی جو ہو آتے ہیں کتنے کلبوں سے

ہم جھوٹ کا ہر زعم مٹانے پہ تلے ہیں
مرعوب ہیں دولت سے نہ عالی نسبوں سے
افلاس نے گہنائے ہیں کتنے ہی مہ و مہر
ہر روز ہیں چکر مطبوں تک مطبوں سے
ہم ظلمتِ دوراں میں بنے مژدۂ خورشید
مانندِ سحر گذرے ہیں تاریک شبوں سے
تکمیلِ ہنر ذات کی تکمیل کی مظہر
آئینہ نہاں کیوں ہے مقابل طلبوں سے
شاید وہ سمجھ جائے سلیم اپنی تمنا
ربط اپنے لبوں کا ہے بہت اس کے لبوں سے

شکم سیری اور اس کے بعد تمباکو کا اک سوٹا
جو صحرا میں بھی حاصل ہو تو پھر ہر سو ہے گل بوٹا
ابھی نو خیز کلیوں کی طرف نظریں اٹھائی تھیں
اِدھر اک گل اُدھر کوئی شگوفہ شاخ سے ٹوٹا
سراپا جز لطافت تھی، جو رنگت تھی، جو نکہت تھی
مقدر اپنا کتنی نرم و نازک چیز سے پھوٹا
چلو یہ تجربہ مہنگا نہیں اک صدق پرور کو
جو دیکھا جانب مقتل تو پایا سر بسر جھوٹا
شب تاریک کا سینہ ستارے چھید سکتے تھے
زمیں کی سمت سے بھی پھلجڑی کا سلسلہ چھوٹا
سلیم اب شہر کے رکھوالے جتنے ہیں نرالے ہیں
کہ جتنی بار بھی لوٹا غریبوں کا نگر لوٹا

پیکرِ تمنا کا چہرہ دیکھنا ہوگا
کون بچ کے نظروں سے دل میں چھپ گیا ہوگا
ربطِ شبنم و گل سے ہے چمن کی آبادی
وصل کے تقاضے پر کیوں کوئی خفا ہوگا
فرقتوں کا ہر لمحہ اس گھڑی سے بڑھ کر ہے
جب بدن کا ہر ریشہ کھنچ کے ٹوٹتا ہوگا
جو نظر کو بھٹکائے جو کبھی نہ ہاتھ آئے
آدمی وہ کیا ہوگا، وہ تو پھر خدا ہوگا
دار و گیر کے نعرے، پیار پر کڑے پہرے
ہر کوئی مگر دل میں اس کو پوجتا ہوگا
رخ بدل کے بیٹھا ہے ایک اک کے پہلو میں
وہ حیا کے بارے میں یونہی سوچتا ہوگا

غم نے یوں تو تڑپایا، اے اگر وہ دن آیا
جب ترا تصور بھی درد سے جدا ہوگا

بے سُوا قیامت سے جیتے جی ہی مر جانا
حشر میں تو سن لو گے مردہ جی اٹھا ہوگا

چونک چونک جاتا ہوں جب خیال آتا ہے
پشتِ نمر پر چھپ کر تو بھی ہنس رہا ہوگا

کتنی بند گلیوں کی توڑدی ہیں دیواریں
جب جنوں سلامت ہو راستہ کھلا ہوگا

کیوں سلیم طعنہ دیں اس کو بے وفائی کا
اپنی ذات کی حد تک خیر باوفا ہوگا

ہر قدم حسینوں کی شانِ خود نمائی ہے
ہوش ہو نہ ہو لیکن جان پر بن آئی ہے
ظلمتوں کے جنگل میں شعلۂ صدا بھڑکا
دامنِ تصور میں کس کی خوش نمائی ہے
جلترنگ یادوں کا ارغنوں خیالوں کا
نغمۂ خموشی اک رقص آزمائی ہے
جب بھی پھول مہکے ہیں جب ستارے چمکے ہیں
اہلِ غم کی ظالم نے کیا ہنسی اڑائی ہے
جن سے خلوتیں مہکیں جن سے جلوتیں چمکیں
ان میں ہر حسیں اب کیوں وقفِ پارسائی ہے
کیسے کیسے دکھ لائی، اپنی بزم آرائی
یا خیالِ دوری ہے یا غمِ جدائی ہے
اک یگانہ بنتا ہے کیوں سلیم دیوانہ
کیسی دلربائی ہے، کیسی آشنائی ہے

خودفراموشی کی لے میں جب بھی ڈھل جاتا ہے دل
جانے کس جادو سے عکسِ یار بن جاتا ہے دل

کون بتلائے کہاں ہے اب حدِ وصل و فراق
دھڑکنوں میں تیری ہی آواز بن جاتا ہے دل

جب سکوتِ شام کے پردے اٹھاتا ہے کوئی
نغمۂ وارفتگی کی تان بن جاتا ہے دل

حرفِ مطلب لب پہ آ کر بھی ادا ہوتا نہیں
کانپتے جاتے ہیں لب اور ڈوبتا جاتا ہے دل

ہو اگر برہم، دو عالم کی حقیقت ہیچ ہے
ورنہ حسنِ رہگذر سے بھی بہل جاتا ہے دل

یوں ہی ہِل مِل کر گذرتی جا رہی ہے زندگی
دل کو بہلاتا ہوں میں اور مجھ کو بہلاتا ہے دل

ذرہ ذرہ جزوِ موجِ جاوداں بنتا ہے جب
موت کا عقدہ اسی لمحے میں سلجھاتا ہے دل

سہہ رہا ہے ہر طرح سے حملۂ بادِ سموم

وہ چمن رنگیں امیدوں کا، جو کہلاتا ہے دل

لاکھوں آوازیں، ہزاروں رنگ، لاکھوں نکہتیں

تو نہیں ہوتا تو کیا گلزار دکھلاتا ہے دل

آتے جاتے لمحے اب کیا کیا دکھاتے ہیں سماں

آتی جاتی سانس میں جاتا ہے دل، آتا ہے دل

☆☆☆

بھولتے ہیں جو مجھ کو کیا ضرور بتلانا
میں سلیم ہوں مجھ کو آپ نے نہ پہچانا؟
قتل عاشقوں کا ہے، جشن ظالموں کا ہے
تم بھی دیکھنا چاہو تو ضرور آ جانا
ہم نے پیار کا دھوکہ جان بوجھ کر کھایا
زندگی کو لازم تھا رنگ روپ پر آنا
لوٹ پھیر کر ہم پر ظالموں کی تہمت ہے
جن کا کام رہتا ہے بس قیاس دوڑانا
بیخودی میں پنہاں تھی آگہی کی اک دنیا
ایک ایک رستے سے اپنا بے خبر جانا
آج کا ہے غم آساں کل کے خوابِ رنگیں سے
اک نہ اک تصور سے اپنے جی کو بہلانا

یاد کے چمن میں تم جب بھی آ نکلتی ہو
پنکھڑیوں میں کانٹوں کو کس طرح بدلتی ہو
کون سے خیالوں نے تم کو آج گھیرا ہے
کیوں قریب تر آ کر دور جا نکلتی ہو
اے شباب کے پیکر، رنگ روپ کے مظہر
طفلِ سادہ بن کر کیوں اپنی آنکھ ملتی ہو
کیا ادا ہے تتلانا، بار بار اٹھلانا
کیسی بات کرتی ہو، کیسی چال چلتی ہو
کس نظر کے ہیں تیشے، کون سے ہیں اندیشے
آتے آتے پہلو میں کس لیے سنبھلتی ہو
اورکون ہے جس کو دل میں دی جگہ ہم نے
پھر وہ کون ہے جس سے تم مدام جلتی ہو
کیوں ترا سلیم آخر ہاتھ پیار سے روکے
آگے آتے آتے کیوں اپنا رخ بدلتی ہو

فشارِ فکر سے پھٹتا ہوا دماغ مرا
بجائے بادہ دھوئیں سے ہے پر ایاغ مرا
نظر فضا میں ہے آنکھوں میں رنگِ مستقبل
خلا نوردیٔ پیہم ہے سیر باغ مرا
مرا کلام ہی آئینہ میری ذات کا ہے
لگا سکو گے مرے شعر سے سراغ مرا
ہنسی میں جیسے چمکتے ہوئے شرارے ہوں
ہر ایک رنگ میں جلتا ہے دل کا داغ مرا
وہی خیال جو راتوں کی نیند اڑا جائے
وہی خیال ہے سامانِ صد فراغ مرا
سلیم جس کے تلوّن میں ہے بہار و خزاں
اسی سے عہدِ جوانی کا باغ و راغ مرا

ہمارا کام جی کو بزمِ تنہائی سے بہلانا
مگر تم غیر کی افسانہ سازی میں نہ آجانا

کسی کی مصلحت کوشی، کسی کی خود فراموشی
نہ تم نے ہم کو پہچانا نہ ہم نے تم کو پہچانا

ہمارے درد کے لاکھوں ہی افسانے بنے، لیکن
وقارِ عشق کو لازم نہ آیا جی کا بھر آنا

سوا نیزے کے سورج سے زیادہ جان لیوا ہے
قیامت سے سوا ہے تیرے جلوؤں کا سمٹ جانا

بہت ہی سرد مہری سے ہمارا نام لیتے ہیں
وہ جن کا شغل ہے دل میں ہمارا نام دوہرانا

کدورت کہر بن کر چھا گئی تھی دل کے گلشن پر
ترا آنا ہے جیسے آفتابِ صبح کا آنا

ہر اک گلبن سے ہم نے کسبِ راحت کی تمنا کی
جلی شاخِ نشیمن تو چمن کو اپنا گھر جانا

کبھی یوں بھی ہوا ہم نے متاعِ ہر دو عالم کو
نظر بھر کر جو دیکھا تو سراسر بے اثر جانا

سلیم اس سادگی کا اصطلاحاً نام کیا رکھیں
کسی کی مست نظروں کا نگاہِ غیر تک جانا

فریبِ پیہم غرورِ محکم شرستِ سرمایہ دار میں ہے
علاج اس شیطنت کا محنت کشوں کے بھرپور وار میں ہے
قریب ہے اب کہ اہلِ ساحل کی بزمِ عشرت ڈبو کے رکھ دے
یہ جوشِ پیہم یہ سیلِ برہم جو موجۂ بے قرار میں ہے
جلا کے اک روز خاک کر دے گا قصرِ شاہی کے بام و در کو
یہ شعلۂ سرکشی کہ پنہاں ہماری جانِ نزار میں ہے
یہ آسماں بوس قصر جن میں چراغ جلتے ہیں معصیت کے
مٹا کے رکھ دو انھیں کہ مدت سے وقت اس انتظار میں ہے

دل پر بس اک کرم کی نظر کر سکے تو کر
میری شبِ الم کی سحر کر سکے تو کر

اپنی فغاں رہینِ اثر کر سکے تو کر
اس بیوفا کے دل میں جو گھر کر سکے تو کر

دنیا میں رنج و غم سے کسے مل سکی نجات
اے دل اگر خوشی سے بسر کر سکے تو کر

وابستہ دردِ عشق سے لطفِ حیات ہے
یعنی جہانِ غم میں گذر کر سکے تو کر

جو حاصلِ عبادت و مقبولِ حسن ہو
ایسا بھی ایک سجدہ اگر ہو سکے تو کر

بہتر ہر اک سکوں سے ہے غمِ اضطراب ہے
دنیائے دل کو زیر و زبر کر سکے تو کر

جو ہو سکے تو اشکِ محبت بہا سلیم
ان پر نثار لعل و گہر کر سکے تو کر

خیالِ سجدہ گہِ نقشِ پا نہیں جاتا
مگر ستم ہے کہ سجدہ کیا نہیں جاتا
سوائے آئینہ اے محوِ جلوہ آرائی
کوئی بھی تیرے مقابل کیا نہیں جاتا
ہزار صدمے سہے ہیں مگر یہ عالم ہے
کہ تیرے ہجر کا صدمہ سہا نہیں جاتا
بس اک نگاہ کے بسمل ہیں تیرے سب بسمل
تری نظر کا نشانہ خطا نہیں جاتا
کسی سے ترکِ تعلق ہزار ہو لیکن
سلیم ترکِ تعلق کیا نہیں جاتا

جنونِ شوق نہیں سوزِ جاں گداز نہیں
خطا معاف وہ لطفِ نیاز و ناز نہیں

اگر جہاں میں محبت گناہ ہے زاہد
تو پھر خدا کی قسم کوئی پاکباز نہیں

ہزار عشوہ و اندازِ حسن ہیں لیکن
کوئی حریفِ نگاہِ جنوں نواز نہیں

وہ کون ہے جو محبت میں چور چور نہ ہو
نگاہِ ناز کی کس دل پہ ترکتاز نہیں

نماز تو ہے سراپا نیاز ہو جانا
بجز نیاز مکمل تری نماز نہیں

یہ کس کے جلوے ہیں کون و مکاں پہ چھائے ہوئے
اگر تجلیِ حسنِ کرشمہ ساز نہیں

یہ اک ادائے جنوں سازِ حسن ہے ورنہ
کسی کے حال سے غافل نگاہِ ناز نہیں

زباں خموش ہوئی تو نظر نے کہہ ڈالا
تری نگاہ سے پوشیدہ دل کا راز نہیں

سرورِ لطف کہاں، کیف و انبساط کہاں
اگر جہانِ محبت میں سوز و ساز نہیں

فسونِ شعبدۂ ہست و بود کیا کہیے
کہ ذرہ ذرہ یہاں جز طلسمِ راز نہیں

سلیم یہ بھی خرد ہی کی کم نگاہی ہے
وگرنہ حسن و محبت میں امتیاز نہیں

جب تبسم ترے ہونٹوں پہ بکھر جاتا ہے
سب گلستاں کا گلستان ہی نکھر جاتا ہے

یہ ترے جور و ستم یاد رہیں گے دل کو
ورنہ جو وقت بھی آتا ہے گزر جاتا ہے

اف وہ خوددار جو سجدوں سے تو کرتا ہے گریز
تیرے کوچے میں بصد شوق مگر جاتا ہے

زندگانی کا جب آغاز ہے انجام بھی ہے
آدمی کس لیے انجام سے ڈر جاتا ہے

پاسکا ہے نہ تری ایک جھلک بھی اب تک
جو تجھے ڈھونڈنے تا حدِ نظر جاتا ہے

اشکِ غم یہ تو نہیں ہے کہ کبھی تھم نہ سکیں
ان کے آتے ہی یہ طوفان ٹھہر جاتا ہے

ابھی جی بھر کے بھی تجھ کو نہیں دیکھا میں نے
ٹھہر اے دوست مرے دوست کدھر جاتا ہے

حرم و دیر کا پابند نہیں اپنا دل
تیرے جلوے نظر آتے ہیں جدھر جاتا ہے

لطفِ ہستی وہی دنیا میں اٹھاتا ہے سلیم
جو خطر گہ میں بھی بے خوف و خطر جاتا ہے

کبھی مہیب سی راہوں سے ڈر بھی جاتے ہیں
انہی رہوں پہ کبھی بے خطر بھی جاتے ہیں
تصورات کی دنیا تجھی سے ہے آباد
ہمارے ساتھ ہے تو ہم جدھر بھی جاتے ہیں
یہ ٹھہرے ٹھہرے ہوئے سے سرشکِ غم ہمدم
یہ تارے ٹوٹ کے اکثر بکھر بھی جاتے ہیں
بنی نہ اپنی ہی تقدیر ورنہ دنیا میں
بہت ہیں جن کے مقدر سنور بھی جاتے ہیں
ہر ایک ہجر کے صدمے تو سہہ نہیں سکتا
کئی فراق کے صدمے سے مر بھی جاتے ہیں
وہ سخت لمحے جنھیں کاٹنا ہے سخت محال
وہ لمحے رکتے ہوئے سے گزر بھی جاتے ہیں
نہیں کہ ساری ہی آہیں اثر بھی کر جائیں
سلیم نالۂ غم بے اثر بھی جاتے ہیں

دل گو کہ اب حوصلۂ غم نہ توانائی ہے
پھر بھی ہر بات میں اندازِ شکیبائی ہے
یوں نگاہوں کو بچاتے ہوئے جانے والے
کیا یہی عرضِ محبت کی پذیرائی ہے
کیا قیامت ہے ہوا جس کی محبت میں خراب
مجھ سے ملنے میں اسے بھی غمِ رسوائی ہے
ہے کچھ اس طرح سے وقفِ غمِ ناکامیِ دل
آج کھائی ہوئی ہر چوٹ ابھر آئی ہے
ایک مدت سے ہے گو ترکِ تعلق تجھ سے
آنکھ بھر آئی ہے جب بھی تری یاد آئی ہے
پھر سلیم آج ہوئے داغِ محبت تازہ
دل کے اجڑے ہوئے گلشن میں بہار آئی ہے

ہر موجِ بحر غیرتِ گرداب ہوگئی
کشتی کچھ ایسے ڈھنگ سے غرقاب ہوگئی
ان کے حضور سرخیِ چشمِ گہر فشاں
افسانہ ہائے دیدۂ بے خواب ہوگئی
کب تک تلاشِ جنسِ وفا اب وفا کہاں
عنقا کی طرح دہر میں نایاب ہوگئی
تجھ کو قسم ہے دوست محبت کی قدر کر
یہ جنسِ لازوال بھی کمیاب ہو گئی
جو زندگی پیامِ مسرت بنی رہی
کیوں گردشِ فلک سے وہ اک خواب ہو گئی
دیکھا کچھ اس نگاہ سے تو نے مری طرف
جو آرزو تھی ماہیِ بے آب ہو گئی
ان کی نگاہِ لطف کے اعجاز سے سلیم
ہر فصلِ آرزو مری شاداب ہو گئی

دیکھ سکتے ہم تو یہ رنگین منظر دیکھتے
حشر تک تیرا جمالِ ناز پرور دیکھتے

پھر جنونِ شوق کا عالم ستم گر دیکھتے
تم مری جانب ذرا سا مسکرا کر دیکھتے

شرم اگر ہوتی عناں گیرِ نگاہِ التفات
تو نگاہوں سے نگاہوں کو بچا کر دیکھتے

زندگانی ساتھ دیتی تو پس از جور و جفا
کچھ ترا لطف و کرم بھی بندہ پرور دیکھتے

آنسوؤں سے پاک کر ڈالا ہے سب گرد و غبار
ورنہ اس آئینۂ دل کو مکدر دیکھتے

کچھ ہمیں سے ضبط کا دامن نہ چھوٹا ورنہ دوست
اپنی پلکوں پر نہ جانے کتنے گوہر دیکھتے

کچھ ترے بحرِ کرم کو جوش آ جاتا اگر
کیوں ترے دیوانے کو سب خاک بر سر دیکھتے

ہم اگر روشن نہ کرتے دل کے داغوں کے چراغ
کس طرح سے جادۂ ہستی منور دیکھتے

ہم ہی دنیا کے نظاروں سے نکل آئے سلیم
ورنہ شاید کچھ نہ کچھ دلچسپ منظر دیکھتے

فصلِ بہار آئی لیکن بہار کب تک
غنچوں کی مسکراہٹ گل کا نکھار کب تک
یہ دردو غم یہ صدمے یہ سوگوار لمحے
باقی رہیں گے یونہی پروردگار کب تک
قابو میں کچھ نہیں ہے کیا اشک اور کیا دل
دیکھا کریں یہ سب کچھ بے اختیار کب تک
ملتے رہے ہو مجھ سے بیگانہ وار لیکن
ملتے رہو گے مجھ سے بیگانہ وار کب تک
کچھ تلخ ہیں حقائق جن سے مفر ہے مشکل
ان تلخیوں سے لیکن سعیِ فرار کب تک
اف دوستی کے پردے میں دشمنی کے حربے
او دوستی کے دشمن پوشیدہ وار کب تک
کب تک سلیم غم کے نشتر چبھا کریں گے
لٹتا رہے گا دل کا صبروقرار کب تک

اب آ بھی جا کہ مری جاں نکلتی جاتی ہے
حیات اشک کے سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے
ہر ایک کے لیے پیغامِ چشمِ یار ہے اور
کچھ ایسی طرز سے پہلو بدلتی جاتی ہے
قرار کا ہے یہ عالم کہ بے قراری بھی
ہزار طرح سے کروٹ بدلتی جاتی ہے
ہوئی ہے یاس سے ہی قطع آرزو لیکن
اسی کی گود میں امید پلتی جاتی ہے
چمن سے کیا کوئی شعلہ نوا ہوا رخصت
کہ شاخِ گل کفِ افسوس ملتی جاتی ہے
غموں سے تا بکجا دل کو ہو پریشانی
بہت دنوں سے طبیعت سنبھلتی جاتی ہے
یہ غم کے دن نہ رہیں گے گذر ہی جائیں گے
سلیم عمرِ زیاں کار ڈھلتی جاتی ہے

جہانِ دل تیرے جلوؤں سے ہو گیا معمور
کہاں کا شعلۂ سینا کہاں کا جلوۂ طور

سمجھ سکے نہ تجھے تو یہ کچھ بعید نہ تھا
ہمیں خود اپنی حقیقت کا ہو سکا نہ شعور

وجودِ عشق سے قائم ہے حسن کی شہرت
اسی نے کی ہیں تری بے نیازیاں مشہور

ہمیں بھی تھامے ہوئے تھا خیالِ خودداری
وہ ہم سے دور رہے جب بہ اقتضائے غرور

یہ اذن دے کہ میں توڑوں طلسمِ خاموشی
زمانہ یہ نہ کہے اب کہاں کوئی منصور

یہ کس کی مست نگاہوں کا فیض ہے ساقی
کہ ذرہ ذرہ ہے سرشار و بیخود و مخمور

تری خوشامدِ بے جا تو کر نہیں سکتا
میں ایک بار بھی تجھ کو نہ کہہ سکوں گا حضور

غمِ حیات سے 'پی کر' نجات پانے دے
مجھے عقوبتِ دوزخ ہے محتسب منظور

نظر کے سامنے جلوہ نمائیاں کی ہیں
اگر رہا ہے کوئی دل کی وسعتوں سے دور

ترے بغیر مجھے کچھ نظر نہیں آتا
اب آ بھی جا کہ ان آنکھوں کو مل سکے پھر نور

مری نگاہ میں رقصاں ہے کائنات سلیم
عطا کیا ہے مجھے عشق نے کچھ ایسا سرور

سراغ دوست کچھ کچھ پا رہا ہوں
مجھے لینا کہ کھویا جا رہا ہوں

فریب التفات دوست توبہ
سمجھتا ہوں مگر پھر کھا رہا ہوں

رہِ ہستی کی منزل بھی ہے کوئی
بہت مدت سے چلتا جا رہا ہوں

یہ کیا شے تو نے نظروں سے پلا دی
بہکتا ہی بہکتا جا رہا ہوں

فریب دوستی کھاتا رہوں گا
فریب دوستی کھاتا رہا ہوں

ستاروں کی قسم اے شامِ فرقت
کہ پھر آنکھوں میں آنسو پا رہا ہوں

جنوں کی کار فرمائی ہے شاید
گریباں سے الجھتا جا رہا ہوں

سلیم ان کو وفا آئے نہ آئے
مگر میں ہوں کہ دل بہلا رہا ہوں

کارواں باقی ہے آوازِ جرس باقی ہے
اب بھی منزل کی تمنا میں نفس باقی ہے

رک سکوں گا نہ میں تعمیرِ نشیمن سے کبھی
سارے گلشن میں اگر ایک بھی خس باقی ہے

کیا قیامت ہے کہ سر پھوڑتے جاتے ہیں اسیر
ہم نشیں پھر بھی ہر اک تارِ قفس باقی ہے

جام اٹھانے کی سکت تک نہیں ہاتھوں میں مگر
دل میں ساقی ابھی پینے کی ہوس باقی ہے

اس نے ہونٹوں سے پلائے ہیں بہت جام مگر
وہی جاں بخش حلاوت وہی رس باقی ہے

وجہِ صد ننگ ہے پھر فقر و غنا کچھ بھی نہیں
مال و دولت سے اگر کچھ تجھے مس باقی ہے

گو کہ مدت سے ہیں آزاد اسیرانِ چمن
آج تک تلخیِ ایامِ قفس باقی ہے

ختم ہیں عیش کے دن اور جنے جاتے ہیں
اب کہاں شہد مگر حرصِ مگس باقی ہے

زندگی موت سے بد تر ہوئی جاتی ہے سلیم
لیکن اب بھی وہی جینے کی ہوس باقی ہے

قدم قدم پہ ترا غم فریب ساماں تھا
غمِ حیات بھی تیرے ہی غم میں پنہاں تھا
ہمیں کچھ اہلِ وفا سے کشیدہ خاطر تھے
وگرنہ عذرِ تغافل بہت ہی آساں تھا
حیات و مرگ کا ہر راز دل پہ فاش ہوا
تری نظر کے تغیر کا یہ بھی احساں تھا
جنونِ غم میں ہوا بارہا یہی محسوس
گلوں کا دامنِ صد چاک اپنا داماں تھا
ترے خیال سے بھی آج کل گریزاں ہے
یہ دل کہ تیری محبت میں محشرستاں تھا
ستم زدہ تو بہر حال شادماں تھے سلیم
یہ اور بات ہے خود حسن ہی پشیماں تھا

یہ نکتہ کاش دلِ غم زدہ سمجھ جائے
کسے پڑی ہے کہ دکھ میں کسی کے کام آئے

دل اس طرح سے غمِ ہجر سہہ گیا جیسے
کسی عزیز کے اٹھنے پہ صبر آ جائے

یہ چاندنی، یہ ترا قرب، یہ چمن، یہ فضا
یہ زندگی اسی ماحول میں ٹھہر جائے

ستم ہے اہلِ وفا کے لیے ملامتِ حسن
تری جفاؤں پہ ہم کیسے کیسے شرمائے

یہ جبرِ زیست کی زنجیرِ بے نشاں، یہ دام
یہ زندگی ہے تو پھر اس زندگی سے بھر پائے

فضائے گلشنِ ہستی لرز لرز اٹھی
حقیقتوں سے کچھ اس طرح خواب ٹکرائے

نہ جانے اور بھی کن مرحلوں سے گذرے ہیں
جنوں نواز بنے، غم نصیب کہلائے

جہاں جہاں غمِ دوراں نے لی ہے انگڑائی
وہاں وہاں ترے انداز ہم کو یاد آئے

خبر نہیں کہ کہاں کاروانِ زیست رکے
نہ جانے کون سی منزل پہ دل ٹھہر جائے

سلیم عیش کے لمحے کچھ اس طرح گذرے
چمن سے جیسے گذر جائیں شام کے سائے

جب کبھی تو نظر سے دور ہوا
دل سے نزدیک تر ضرور ہوا
اوج پر ہے کمالِ رسوائی
شہرۂ عشق دور دور ہوا
اب مسرت بھی خوش نہیں آتی
دل یہ کیا حالِ ناصبور ہوا
بارہا بے وجہ اداس ہوئے
بارہا بے سبب سرور ہوا
جس کسی کی طرف نظر اٹھی
فرطِ نشہ سے چور چور ہوا
ان کے جلوؤں کی زد میں آ کے سلیم
دل کا ہر گوشہ رشکِ طور ہوا

ہمارے دم سے ہے تزئینِ عالمِ ایجاد
ہمیں نے کی ہیں محبت کی بستیاں آباد

چمن چمن ہے ہمارے لہو کی شادابی
کلی کلی ہے ہماری وفاؤں کی روداد

جسے حیات کی زنجیر بھی نہ روک سکی
رکے گا موت سے کیسے وہ بندۂ آزاد

ڈرا سکی نہ ہمیں زندگی کی طغیانی
بھنور میں ڈال دی کشتی کہ ہر چہ بادا باد

کچھ ایسے دن بھی گذارے تری محبت میں
لبوں پہ مہر خموشی نگاہ میں فریاد

ہوئی ہے یورشِ غم بھی کبھی کبھی لیکن
چمن میں لالہ و گل کی طرح رہے ہیں شاد

تری نظر کا سہارا بنے ہوئے ہیں ہم
قدم قدم پہ کیے ہم نے میکدے آباد

سلیم حسن کی کیا مہربانیاں کہیے
عنایتیں ہی تو ہیں اہلِ درد پر بیداد

☆☆☆

ہزاروں بھٹکی ہوئی امیدوں کے نقش دل پر ابھار آئے
تمھاری محفل میں جب بھی زحمت کے چند لمحے گذار آئے

کبھی انھیں دیکھنے کی دھن میں ہزاروں گلیوں کی خاک چھانی
کبھی یہیں ملنے بھی نہ پائے جو وہ سرِ رہگذار آئے

اگر یقیں ہو کہ تیرا کھویا ہوا خلوص اب بھی مل سکے گا
تو موت کی جاں گداز وادی میں بھی تجھے دل پکار آئے

مہکتی کلیو، شگفتہ پھولو، یہ راز شبنم کو بھی بتانا
کہ تم غمِ جاں گسل کا بارِ گراں کہاں پر اتار آئے

کبھی بڑھے ہم، کبھی رکے ہم، کبھی یونہی سوچتے رہے ہم
ترے محبت کے راستے میں یہ مرحلے بار بار آئے

یہ کیا جنوں ہے کسی کے ہوتے ہوئے بھی دل کو سکوں نہیں ہے
کوئی اشارہ، کوئی سہارا ہو جس سے دل کو قرار آئے

ملے جو میری فسردہ نظروں کو تیرے جلووں کی تابناکی
تو میری افسردہ آرزوؤں کے گلستاں میں بہار آئے

چمن میں پھولوں کی ہر روش پر صبا کچھ اس طرح چل رہی ہے
کہ جس طرح میکدے سے بہکا ہوا کوئی میگسار آئے

سلیم بے مہریٔ بتاں کا گلہ بھی کیجیے تو جیسے کیجیے
کہ اپنے یاروں کی بزم میں بھی گئے تو ہم دلفگار آئے

☆☆☆

تو ہی اپنا نہیں ہے جب دمساز
شدتِ غم میں دیں کسے آواز

آج دوہرا رہی ہے تنہائی
چپکے چپکے سے داستانِ نیاز

میری رگ رگ میں بجلیاں بھر دیں
وہ کسی کی نگاہ کا انداز

دکھ بھرا راگ کس نے چھیڑ دیا
میرے ہاتھوں میں تھا خوشی کا ساز

آ ہی جائیں گے وہ نہ ہو مایوس
اے شبِ ہجر تیری عمر دراز

ن خلاؤں میں جانے ڈوب گئی
دل نے دی جب کبھی تجھے آواز

دل کے زخموں کو بھر ہی دیتے ہیں
جلوۂ گل ہو یا صدائے ساز

دل نہ بھٹکا رہِ محبت سے
یوں تو آئے بہت نشیب و فراز

آگ ہے تیری نئے، وجودِ سلیم
پھونک ہی سے نہ شعلۂ آواز

اپنا رنجِ ناکامی جاگ اٹھا اے دل
جب کسی کو پھر سمجھا درد آشنا اے دل
دشتِ زندگی میں ہے اک مہیب سناٹا
قافلہ محبت کا آج پھر لٹا اے دل
ہے شکستِ رنگِ گل کس قدر سکوت افروز
تیرے ٹوٹنے کی بھی کچھ نہ ہو صدا اے دل
کس قدر خراشیں ہیں چہرۂ وفا پر آج
اہل دل بھی نکلے ہیں دشمنِ وفا اے دل
خواہشیں ہیں لا محدود اور راستے محدود
دل کہیں نہ پھٹ جائے کائنات کا اے دل
مہوشوں کی چاہت میں غم سے جب اماں چاہی
زندگی کا ہر صدمہ ہم پہ ہنس پڑا اے دل

جو دل میں کوئی تمنا نہ ہو تو کیا کیجیے
جو ہو بھی تو کوئی در وا نہ ہو تو کیا کیجیے
جنوں میں دشت نوردی کی راحتیں معلوم
وسیع دامنِ صحرا نہ ہو تو کیا کیجیے
کہا اسے کہ مزاج دل اب نہیں ملتا
مگر وہ شوخ ہی سمجھا نہ ہو تو کیا کیجیے
چلیں کسی کی گھنی زلف سے ذرا کھیلیں
وہ شوخ ہو مگر ایسا نہ ہو تو کیا کیجیے
امنڈ رہا ہو جو غم سیلِ بیکراں کی طرح
اور آنکھ میں کوئی قطرہ نہ ہو تو کیا کیجیے
کسی کی لاج کی خاطر جنوں زدہ ہی سہی
خیال میں بھی جو سودا نہ ہو تو کیا کیجیے
ہیم سانپ صفت لوگ معتبر ہی سہی
جو سائے پر بھی بھروسا نہ ہو تو کیا کیجیے

نہ ہے سکوں کو دوام اور نہ درد ہی کو ثبات
کہ خود ہے گردشِ پیہم کی زد میں دورِ حیات

کبھی یہ فکر کہ فارغ کہیں نہ بیٹھے جنوں
کبھی یہ غم کہ گئے فرصتوں کے دن ہیہات

محبتوں کا سکوں تیرا سایۂ دیوار
مسافروں کا ٹھکانا جہاں کہیں بھی ہو رات

بڑھا ہے پھر دلِ امیدوار کا دامن
چلی ہے پھر سے تری سمت آنسوؤں کی برات

ہیں زہرِ غم کا مداوا، مگر نصیب کہاں
تمھارے ہونٹ کہ ہیں جن سے مات قند و نبات

کبھی ملا ہے کوئی ہم سا درد مند تمھیں؟
ہو جس کے لب پہ شکایت نہ کوئی رنج کی بات

عجیب کرب و بلا ہے تمھارے ہجر کا دشت
کہ جس سے دور نہیں وصلِ جاں فزا کا فرات

صنم کدہ ہو کہ میخانہ یا کہ صحنِ چمن
کسی کو کیا جو بسر ہوں ہمارے بھی اوقات

وہ مئے بھی ہم کو میسر ہے میکدے میں سلیم
کہ جس کے کیف میں پنہاں ہے حسرتوں سے نجات

شفق کے رنگ میں خوش بوئے زلفِ یار تو ہے
اگر چمن میں نہیں ہے کہیں بہار تو ہے

متاعِ دیدۂ تر بھی ہمیں مبارک ہو
کہ آج بے حسیِ دل نظر پہ بار تو ہے

نہ جانے کب میں زمانے کی سمت آؤں گا
ترا نہیں نہ سہی اپنا انتظار تو ہے

یہاں بھی درد کی کلیاں کھلی ہیں ہر جانب
ہوائے دشت میں اندازِ کوئے یار تو ہے

ہر ایک ٹیلے پہ بستی کا ہی گماں گذرا
دیارِ حسنِ بیاباں نہ ہو، دیار تو ہے

نہ تیری آنکھ سے پی ہے نہ چشمِ ساقی سے
نہ جام سے کہ وفا میں ابھی خمار تو ہے

وہ اہلِ عشق بڑھے تند آندھیوں کی طرح
خلل پذیر بنائے صلیب دار تو ہے

سلیمؔ کیوں ہو غمِ بے وفائی جاناں
کہ دل پذیرئی دوراں پہ اعتبار تو ہے

میکدے ہی میں یہ آداب نظر آتے ہیں
کہ دل افسردہ بھی شاداب نظر آتے ہیں

جب سے ان آنکھوں کی چھلکی ہوئی پی ہے ہم نے
ہر طرف جامِ مئے ناب نظر آتے ہیں

آپ نے ہم کو جو برباد کیا، خوب کیا
آپ کیوں مضطر و بیتاب نظر آتے ہیں

خواب دیکھا تھا محبت کا مگر خواب نہ تھا
کچھ حقائق تھے جو اب خواب نظر آتے ہیں

چاند تاروں پہ نظر جا کے پلٹ آتی ہے
اپنے ہی دیدۂ بے خواب نظر آتے ہیں

سوزِ غم سے تو وہ اشکوں کا بھی دریا نہ ہو
اب کہاں وہ دُرِ نایاب نظر آتے ہیں

عالی ظرفوں سے جو ہے میکدہ خالی سو ہے
ہم سے انسان بھی نایاب نظر آتے ہیں

ہم ہیں پروانے اگر حسن کا شعلہ ہو قریب
دور سے کرمکِ شب تاب نظر آتے ہیں

کتنا اب فاصلۂ منزلِ جاناں ہے سلیم
کہ زمانے کو ظفریاب نظر آتے ہیں

کڑی نگاہوں سے میری جانب زمانہ چاہے ہزار دیکھے
مگر یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا کہ دل نہ اس کی بہار دیکھے
جسے ہوس ہو حقیقتِ حسن ہو کے عریاں نظر میں آئے
تو جز مہک کچھ نہ مل سکے گا ملباسِ گل کو اتار دیکھے
فقط صدا باز گشت کی ہے اگر ہے کچھ دشتِ آرزو میں
جو دل کو اب بھی یقیں نہیں ہے، تو اس کو پھر سے پکار دیکھے
یہ کیا ستم ہے کہ باغ میں جو بھی باغباں آئے یہ سنائے
کہ سینہ چاکی ہے اس کی قسمت میں جس نے لیل و نہار دیکھے
ہر ایک مونس کا زخم دل کے لیے یہی مرہم سکوں ہے
کہ اور بھی بے قرار دیکھے، کہ اور بھی دل فگار دیکھے
جو اپنے جلوؤں کے جال لا کر دکھانے آئے ہیں رنج و حرماں
انھیں خبر کیا کہ ہم نے ایسے سراب کتنی ہی بار دیکھے
سلیم ہم سے فریب جلوہ شکست کھا کھا کے ہٹ رہے ہیں
کہ ہم نے رخسار و قد و کاکل، قدم قدم پہ ہزار دیکھے

ہر ورق زرد ہے کہاں جائیں
ہر کلی سرد ہے کہاں جائیں

حسن کے سحر میں، حسینوں میں
ہر کوئی فرد ہے کہاں جائیں

شہرِ جلوہ میں جس طرف دیکھا
کوچۂ درد ہے کہاں جائیں

اس قمارِ حیات میں بھی رقیب
ماہرِ نرد ہے کہاں جائیں

خاکِ گل اڑ رہی ہے ہر جانب
گرد ہی گرد ہے کہاں جائیں

تند رو آندھیوں کے لب پر بھی
نغمۂ درد ہے کہاں جائیں

چڑھتے جاڑوں کا سورج اس کا پیار
ژالۂ برد ہے کہاں جائیں

وہ حسینہ وفا کے میداں میں
دشمنِ مرد ہے کہاں جائیں

گرم جوشی سے کیا بنے گا سلیم
ہر فضا سرد ہے کہاں جائیں

صورتِ نجمِ سحر سوئے سفر جائیں ہم
مژدۂ صبح سے آفاق کو بھر جائیں ہم

ہم کو ہے کتنی ہی گم گشتہ بہاروں کی تلاش
ہر طرف ہمرۂ رفتار نظر جائیں ہم

ہم مسافر ہی سہی، کیوں نہ چمن میں اے دل
موجۂ نکہتِ گل بن کے بکھر جائیں ہم

اے صبا جا کے درِ دوست پہ دینا دستک
خاک اگر ہو کے سر راہ بکھر جائیں ہم

بزمِ جاناں کہ ہے شائستۂ نغماتِ طرب
کیسے اس بزم میں با دیدۂ تر جائیں ہم

یہ نہیں وحشت وسودا وجنون تو کیا ہے
جب چلے موجِ طرب درد سے بھر جائیں ہم

ہم کو سودا ہے کہ ہر ذرہ ہو گلشن بکنار
باغبانوں کو یہی دھن ہے کہ مر جائیں ہم

سنتے ہیں فصلِ گل آئی ہے گلستانوں میں
کھلتے پھولوں میں کہاں خاک بسر جائیں ہم
اب تو آنسو بھی نہیں ہیں کہ ہوں نذرِ غمِ دوست
ہاں بس اک ہو کا بیاباں ہے جدھر جائیں ہم
دے رہے ہیں در و دیوار صدائیں ٹھہرو
اور فرمانِ جنوں ہے کہ بکھر جائیں ہم
ہمیں غم خانۂ ہستی کو بدلنا ہے سلیم
اور اگر جی سے گذرتے ہیں گذر جائیں ہم

خونِ ہر آرزو بتِ آشفتہ خو نہ کر
دل کی نگاہ ہیں مجھے بے آبرو نہ کر

جو ہو سکے تو حسنِ حقیقت دکھا مجھے
مجھ کو خراب شعبدۂ رنگ و بو نہ کر

یا داغ اپنے اشکِ ندامت سے دھو کے دیکھ
یا پاک دامنی کے لیے آرزو نہ کر

حاصل جو تجھ کو چشمِ حقیقت نگر نہیں
یہ جستجو بھی خام ہے پھر جستجو نہ کر

لے بارگاہِ حسن میں خاموشیوں سے کام
یعنی بہ طرزِ عام کوئی گفتگو نہ کر

ہر چاکِ دل سے ہم نے اٹھائے ہزار لطف
دو ایک چاک اور سہی اب رفو نہ کر

جب تک کوئی نظر سے پلائے شرابِ عشق
دل کو رہینِ بادۂ و جام و سبو نہ کر

جب لطف ہے سلیم کہ ہمراہ ہو کوئی
تنہائیوں میں سیرِ لبِ آبِ جو نہ کر

میری نظروں میں مری منزل رہی
دل بھٹکتا تھا بڑی مشکل رہی

تم بھی ہم سے کتنے بیگانے رہے
زندگی بھی کتنی بے حاصل رہی

وجہِ دوری تیری خود بینی بھی تھی
میری خودداری بھی کچھ حائل رہی

کیسے کیسے وسوسے پیدا ہوئے
دل سے جب تیری نظر غافل رہی

بزم دل ہے آج اگر سونی تو کیا
مدتوں آباد یہ محفل رہی

کچھ محبت بھی رہی محشر خرام
کچھ تمنا بھی عذابِ دل رہی

کچھ حسینوں سے گریزاں بھی رہے
کچھ طبیعت بھی ادھر مائل رہی

رنجِ ماضی سے ملی فرصت تو پھر
ہم کو فکرِ حال و مستقبل رہی

پے بہ پے صدمے سہے ہم نے سلیم
جانِ مضطر عمر بھر گھائل رہی

ان کی جفا کا شکر ادا کر سکے نہ ہم
یعنی بقدرِ شوق وفا کر سکے نہ ہم

اک تم کو اپنا کر نہ سکے ہم جنوں نصیب
ورنہ تمھارے عشق میں کیا کر سکے نہ ہم

دل میں ہوس بتوں کی لبوں پر خدا خدا
واعظ کبھی یہ مکر و ریا کر سکے نہ ہم

ہے خواہشِ سکوں بھی مگر دل کو آج تک
آمادۂ سکونِ فنا کر سکے نہ ہم

اہلِ جہاں سے ہم کو شکایت ہو کس لیے
جب زندگی میں اپنا بھلا کر سکے نہ ہم

دل سے ترا خیال بھلایا نہ ہم نے دوست
یہ کفر آج تک بہ خدا کر سکے نہ ہم

تم بھی تھے بے نیاز سے ہم بھی تھے بے خبر
کچھ یوں بھی اپنے غم کی دوا کر سکے نہ ہم

وہ خود ہی بڑھ کے تھام بھی لیتے ہمیں سلیم
لیکن مجالِ لغزشِ پا کر سکے نہ ہم

آہوئے دشت کی مانند رم آثار لگے
وہ جو خود میری محبت کا طلبگار لگے

بات کرنے کے سے انداز میں کھولے لب ناز
نوکِ انگشت بہ لب مائل انکار لگے

اف خدایا یہ محبت ہے مصیبت کیسی
یہی کہتے ہوئے جینے سے وہ ہر بار لگے

جائزہ لے مری خوابیدہ تمناؤں کا
میرے افکار کی دنیاؤں کا سیّار لگے

معنیٔ وصل سمجھنے سے گریزاں لیکن
شوخیٔ طبع رسا محرمِ اسرار لگے

تیکھے ہونٹوں پہ وہ موہوم تبسم کا فسوں
خوں میں ڈوبی ہوئی چلتی ہوئی تلوار لگے

ساتھ وہ ہو تو بیاباں بھی گلستاں بن جائے
خار ہوں راہ میں تو سبزۂ بیدار لگے

ہوں نہ یوسف نہ زلیخا کا خریدار سلیم
کوچۂ درد بھی کیوں مصر کا بازار لگے

دشتِ غربت میں ساتھ ساتھ آئے
دور تک تیری یاد کے سائے
حادثوں کے بپھرتے طوفاں میں
زندگی برگِ گُل نہ ہو جائے
ماتمِ مرگِ دوستی افسوس
زندگی نے یہ دن بھی دکھلائے
جانِ بے تاب کو پیامِ سکوں
گیسوؤں کے گھنے گھنے سائے
رچ گئے ہیں فضا میں نکہت و نور
کس کے جلوؤں نے دام پھیلائے
تم صبا تھے مگر تمھارے لیے
کتنے ہی گُل چمن میں مرجھائے
آگ ہی آگ ہے حیات اپنی
کوئی شبنم نہ ہم پہ برسائے

منزلِ شوق ہوگئی آسان
جب بھی دشوار مرحلے آئے

ان بگولوں کی تال پر ناچے
جن سے ہستی کا دل بھی تھرائے

دشمنوں کے بھی دل پہ وار سہے
دوستوں کے فریب بھی کھائے

دل ہے برگِ خزاں رسیدہ سلیم
اب خزاں ٹھہرے یا بہار آئے

صبح کے وقت یہ ختم ہوئی امیدِ وصال
اب کوئی دم میں ہی بجھنے کو ہے فانوسِ خیال
اپنی زلفوں کی گھنی چھاؤں میں دم لینے دے
لطفِ امروز کو یوں وعدۂ فردا پہ نہ ٹال
تیری گردن میں رہے ہاتھ حمائل میرا
عمرِ فانی سے گزرتے رہیں یونہی مہ و سال
پھر وہی جذبۂ موہوم ابھر آیا ہے
وہی مبہم سی نگاہیں وہی بے ربط سوال

منتشر میں مری آہوں کے شرارے اب بھی
میری پلکوں پہ لرزتے ہیں ستارے اب بھی
اب بھی گردابِ بلا گھیرے ہوئے ہو مجھ کو
نظر آتے ہیں نگاہوں کو کنارے اب بھی
جانِ من تیرا سہارا ہو میسر کہ نہ ہو
ڈھونڈتا ہے دلِ مایوس سہارے اب بھی
آج بھی تیری نگاہوں کا اثر باقی ہے
میری رگ رگ میں ہیں پُرسوز شرارے اب بھی
آج بھی عہدِ محبت کا خیال آتا ہے
ذہن میں گھوم رہے ہیں وہ نظارے اب بھی

وہی ہیں حاصلِ ہستی وہی ہیں جانِ حیات
جو تیرے ساتھ گذارے ہیں کچھ حسیں لمحات

خوشا وہ دورِ محبت خوشا وہ دورِ حیات
وہ قہقہے ،وہ تبسّم، وہ کیف ،وہ جذبات

جو تم گئے تو وہی رنج و غم پلٹ آئے
وہی ہیں ہم، وہی دنیا، وہی غم و آفات

یہ کس مقام پہ لائی ہے بےخودی مجھ کو
یہاں نہ دن ہے نگاہوں میں دن نہ رات ہے رات

اشارے پنہاں تھے لاکھوں ہماری باتوں میں
یہ اور بات ہے تو نے سنی نہ کوئی بات

دل آج پھر سوئے میخانہ لے چلا مجھ کو
کہ راہِ میکدہ میرے لیے ہے راہِ نجات

غمِ زمانہ سے فرصت نہ مل سکی ورنہ
دبے ہوئے ہیں مرے دل میں آتشیں نغمات

سلیم غم کدۂ زندگی میں عیش کہاں
یہی بہت ہے کہ مل جائے دورِ غم سے نجات

مسکرا کر بھی چین پا نہ سکے
ہم فریبِ نشاط کھا نہ سکے
تیری بیگانگی کی خو نہ گئی
تجھ کو پا کر بھی تجھ کو پا نہ سکے
دل پہ کیا کیا قیامتیں گذریں
اور ہم ہونٹ تک ہلا نہ سکے
صبحِ عشرت بھی تیرے دیوانے
تلخیٔ شامِ غم بھلا نہ سکے
رنگِ عشرت میں ڈوب کر بھی سلیم
دل کی افسردگی مٹا نہ سکے

بات پھر اس ستم شعار کی بات
لب کشی اپنے اختیار کی بات
جاگ اٹھے کتنے خواب آنکھوں میں
جب چھڑی حسن کے دیار کی بات
جگمگا اٹھیں شبنمیں راتیں
سن کے حسن و جمالِ یار کی بات
کھلتے پھولوں کا تذکرہ ہی سہی
نہ سہی جانِ بے قرار کی بات
موسمِ گل میں تجھ کوبار نہ ہو
ایک بیگانۂ بہار کی بات
ہم تبہ حال ہی سہی لیکن
کیوں کریں جانِ سوگوار کی بات

ہم ہی افسردہ فرطِ یاس سے تھے
یا تمھیں کچھ اداس اداس سے تھے
کس قدر ہم سے دور تھے وہ لوگ
جو کبھی دل کے آس پاس سے تھے
کچھ وہی آشنا تھے دنیا سے
جو زمانے میں نا شناس سے تھے
کتنے بیگانۂ وفا تھے سبھی
گو بظاہر وفا شناس سے تھے
میرا مٹنا تو حادثہ ہی سہی
آپ کیوں اتنے بد حواس سے تھے

یادوں کے جہاں میں کھو گئے ہم
اے حسرت دید لو گئے ہم
تھی ساغرِ نے میں کتنی وسعت
اک عالمِ غم ڈبو گئے ہم
ساحل کی فضا تھی خواب آلود
طوفاں کے حریف ہو گئے ہم
تھی وادیٔ زیست کتنی دلکش
ہر ایک قدم پہ کھو گئے ہم
ہر صدمۂ جاں گسل سے الجھے
ہر غم میں خوشی سمو گئے ہم
تدبیر کا حوصلہ نہ پا کر
تقدیر کا رونا رو گئے ہم
آئینۂ حسن بن گیا دل
خود اپنے رقیب ہو گئے ہم

چونکے تو تھے خوابِ زندگی سے
تھے نیند کے ماتے سو گئے ہم

پھر لوٹ کے آئیں یا نہ آئیں
اک بار یہاں سے جو گئے ہم

کیا جانئے کیوں قریب آ کر
کچھ اور بھی دور ہو گئے ہم

اب دل بھی نہیں ہے اپنے بس میں
اب دل سے بھی ہاتھ دھو گئے ہم

اپنے لیے بارہا چمن میں
کانٹے بھی سلیم میں بو گئے ہم

کہاں خلوص و ہوس کے خزف میں رہتا ہے
گہر ہے، بے غرضی کے صدف میں رہتا ہے
مُغَنّیہ ہی نہ ہو تو کہاں نوا ریزی
اگرچہ سحرِ نوا چنگ و دف میں رہتا ہے
وفا سرشتیِ دل پر ترا ہر اک طعنہ
وہ تیر ہے کہ جواب تک صدف میں رہتا ہے
نہ دار سے ہیں نہ تیر و تفنگ سے خائف
ہم اہلِ صدق ہیں سر اپنا کف میں رہتا ہے
وہ آفتابِ سخن ہیں سلیم ہم کہ، قدم
کوئی بھی وقت ہو برجِ شرف پہ رہتا ہے

ہر سکونِ زندگی سے اب تو گھبراتا ہے دل
اللہ اللہ غم نہ ہونے کا بھی غم کھاتا ہے دل
وسعتِ دل میں جب ان کو جلوہ گر پاتا ہے دل
عالمِ امکاں کی ہر شئے بھول سا جاتا ہے دل
اپنی ناکامی کہاں تک ہو بنائے اضطراب
اب یہ عالم ہے کہ گھبرانے سے گھبراتا ہے دل
جانتا بھی ہے فریب زندگانی کی بساط
پھر نہ جانے کیوں فریب زندگی کھاتا ہے دل
کوئی دکھ ہو کوئی غم ہو کوئی صدمہ ہو مگر
وہ جب آتے ہیں تو سب کچھ بھول سا جاتا ہے دل
بارہا دیکھا ہے انجامِ فریب آرزو
اب فریب آرزو سے سخت گھبراتا ہے دل
کیا بساطِ عزمِ دل تیری رضا کے سامنے
کیسا جذبہ ہو اشارے سے بہلا جاتا ہے دل

یہ کیسے ہمسفیرانِ چمن ہیں کیسا گلشن ہے
کہ اپنے دوست تک اپنے نہیں دشمن تو دشمن ہے
بہار آئی اڑائیں دھجیاں پھر جیب و داماں کی
کسے اب ہوش ہے اتنا کہ یہ جیب اور یہ دامن ہے
تری برقِ تجلّی سے ہے ہلچل بزمِ امکاں میں
کہیں یہ شعلۂ سینا کہیں یہ برقِ ایمن ہے
دلِ برباد کا کیا حال کہیے مختصر یہ ہے
کہ دل اب دل نہیں خوں گشتہ امّیدوں کا مدفن ہے
گلستاں میں نہ پا کر تجھ کو جانے دل پہ کیا گذری
کہ ہم سوچا کیے پہروں یہ صحرا ہے کہ گلشن ہے
چمن میں ہر طرف ہے بجلیوں کی یاد فرمائی
سلیم اس پر بھی دل میں فکرِ تعمیرِ نشیمن ہے

نہ ہوشیار ہی سمجھے اسے نہ دیوانے
یہ کیوں بنا کیے آبادیوں سے ویرانے
سنا سکے نہ غمِ زندگی کے افسانے
تھے ایک شعلۂ جاں‌سوز تک ہی پروانے
مری خموشئ پیہم کو کوئی کیا جانے
مرے سکوت میں پنہاں ہیں کتنے افسانے
ہر ایک بت کدہ تھا مرکزِ نگاہ مگر
ترے بغیر نہ راس نہ مجھ کو بتخانے
کمالِ ہوش ہے دیوانگی محبت میں
کمالِ ہوش میں ہیں دوست تیرے دیوانے
میں پی کے آیا ہوں میخانۂ محبت سے
مری نظر میں ہیں رقصاں ہزار پیمانے
سلیم مٹ نہ سکی تلخئ غمِ ہستی
علاجِ غم ہی سمجھ کر پیے تھے پیمانے

گو تلخ ہے شراب مگر پھر شراب ہے
واعظ یہی تو تلخیِ غم کا جواب ہے

پہلے رہا تغافلِ بے انتہا کا غم
اب یہ خلش کہ تیرا کرم بے حساب ہے

تو ساتھ ہو غیرتِ فردوس ہے چمن
جنت ترے بغیر اگر ہو سراب ہے

اس کے قدم پہ دولتِ کونین ہے فدا
یہ مت کہو خرابِ محبت خراب ہے

ساغر اٹھا کہ پھر غمِ دنیا غلط کریں
ساقی شتاب کر کہ یہ کارِ ثواب ہے

احساسِ کیف کیا میں سراپا سرور ہوں
موجِ نگاہِ ناز وہ موجِ شراب ہے

ہم ہی میں تابِ دردِ محبت نہیں سلیم
پھر کیوں کہیں کہ دردِ محبت عذاب ہے

پیامِ لطف و کرم ہے کسی کی ہر بیداد
ستم ہے شاد اگر ہو نہ خاطر ناشاد

چمن میں سایۂ ابرِ بہار ہوتے ہی
ہزار حشر بپا کر گئی کسی کی یاد

دلِ شکستہ پہ ان کو بہت ہی پیار آیا
بنائے لطف ہوا میرا قصۂ برباد

حوادثِ غمِ دوراں سے ہم کبھی نہ ڈرے
بھنور میں ڈال دی کشتی کہ ہرچہ باداباد

نگاہ ماہ جبینوں کے رخ پہ پڑتے ہی
تڑپ تڑپ کے کیا میرے دل نے ان کو یاد

تھی ایک جنبشِ برقِ بلا کی دیر سلیم
چمن رہا نہ رہا آشیانۂ برباد

یہ ہم نے مانا کہ زندگی کے کسی طرح دن گذر رہے ہیں
مگر یہ عالم ہے اپنے دل کا نہ جی رہے ہیں نہ مر رہے ہیں
یہ کیا خیال آ گیا کہ دل کے دبے ہوئے داغ ابھر رہے ہیں
ہزاروں گذرے ہوئے زمانے مری نظر سے گذر رہے ہیں
بنا بنا کر امیدواروں کے نقش رنگین لوحِ دل پر
ہزار رنگوں سے زندگانی کے سادہ خاکوں کو بھر رہے ہیں
ابھی خزاں دور ہے چمن سے ابھی سے افسردگی سی کیوں ہے
گلوں کے اوراق کیوں ابھی سے روش روش پر بکھر رہے ہیں
بہت سے ہیں جن کی زندگی میں خوشی بھی آئی ہے غم بھی آئے
یہ کیوں تمھارے ستم رسیدہ ہمیشہ اک حال پر رہے ہیں
سلیم جانِ حزیں ہماری سکوں سے ناآشنا ہے اب بھی
ہزاروں نشتر ہمارے دل میں اتر گئے ہیں اتر رہے ہیں

لطف کیا ملے گا اب حالِ دل سنانے سے
جو گذر گئی دل پر تیرے مسکرانے سے
اس نے آزما کے بھی ہم کو باوفا پایا
جس کو بے وفا پایا ہم نے آزمانے سے
تھرتھری سی لہجے میں کپکپی سی ہونٹوں پر
اور بھی نمایاں ہے دردِ دل چھپانے سے
ہر کلی ہے پژمردہ گلستاں ہے افسردہ
اک ہمیں نہیں غمگیں آپ کے نہ آنے سے
اک نشہ سا طاری ہے روح کی فضاؤں پر
کتنی مستیاں بکھریں عشق کے فسانے سے
دل کی بیقراری کا اب سلیم کیا کیجیے
جس نے ہم کو لوٹا ہے نت نئے بہانے سے

دلنوازی کی ادا پھر بھی دل آزار لگے
اپنی معصوم نگاہی میں پُراسرار لگے

میرے افلاس کو دے طعنۂ ثروت ہنس کر
تو نفس ٹوٹتے پیمانے کی جھنکار لگے

بندِ گیسو تو وہ کھولے، نہ قبا کو کھولے
منزلِ شوق نہ آسان نہ دشوار لگے

امتحاں لے جو مرے حوصلہ و ہمت کا
میری پامالیِ دل کے لیے خوددار لگے

مجھ کو دکھلائے محبت کے ہزاروں پہلو
لیکن آمادگیِ وصل سے بےزار لگے

غم کے کتنے ہی پہاڑوں کو دھنک بھی ڈالا
سنگریزے بھی مگر راہ میں دیوار لگے

رقص میں آئے ہوئے موجِ ہوا سے پودے
بارہا رات کی تاریکی میں کہسار لگے

سادگی اپنی ہے یا اہلِ تصنع کا کمال
دشمنِ جاں بھی ہمیں مونس و غمخوار لگے

ہے زندگی تو پھر ترے کرم کا لطف اٹھائیں گے
خوشی میں جھوم جھوم کر خوشی کے گیت گائیں گے
قدم قدم غم و الم کو ٹھوکریں لگائیں گے
کوئی بھی سنگِ راہ ہو خیال میں نہ لائیں گے
تمام پستیوں کو رفعتوں سے دیں گے ہم بدل
اس آسماں سے ہٹ کے اور اک آسماں بنائیں گے
ہے داغ داغ دل مگر چمک اٹھے گی رہگذر
چراغ بن کے ظلمتوں کی زد میں جگمگائیں گے
ہمارے حوصلے بہت تم آزما چکے مگر
جو ہو سکا تمھاری ہمتوں کو آزمائیں گے

تلخیِ زندگی کا نام نہ لے
مجھ سے جینے کا انتقام نہ لے
ڈوب ہی جائے کائنات مری
ہاں اگر تیری یاد تھام نہ لے
جس سے کیفِ دوام مل نہ سکے
دستِ ساقی سے ایسا جام نہ لے
دل محبت سے ہو اگر عاری
تو کوئی زندگی کا نام نہ لے
سوزِ پیہم ہے مدعائے حیات
اثرِ سوزِ نا تمام نہ لے
غمِ دوراں کی زد میں آجائے
دل اگر تیرے غم سے کام نہ لے

☆

چمن میں موجِ مسرت چلی تو غم لائی
کلی جو چٹکی تو شبنم کی آنکھ بھر آئی
طریقِ شوق نہ سلجھے مثالِ صحرائی
تری طلب میں پھرے ملک ملک سودائی
بنے نہ راحتِ جاں کیوں عتابِ تنہائی
روش روش پہ بہاروں نے آگ بھڑکائی

ہزاروں تاریک راستوں میں قدم قدم پر دیے جلائے
مگر ابھی تک اسی طرح سے ہیں ظلمتوں کے مہیب سائے
حیات کی وادیوں میں انساں ہے آج بھی ٹھوکروں کی زد میں
دلِ حزیں پر ہزاروں ناکامیوں کی تلخی کے داغ اٹھائے
ہزاروں تارے چمک چمک کر فضا کی وسعت میں کھو چکے ہیں
مگر مقدر کی تیرگی کے نقوش اب تک نہ مٹنے پائے
حیات اور موت کے معموں میں ذہن الجھا ہوا ہے لیکن
حیات کیا ہے ممات کیا ہے یہ راز کیسے سمجھ میں آئے
ہزاروں دشوار مرحلوں سے گذر چکے ہیں گذر رہے ہیں
مگر خدا جانے اپنی منزل نگاہ کے سامنے کب آئے
ازل سے موہوم قوتوں سے ہے آدمی آج تک ہراساں
نہ جانے کب تک خود اپنی پوشیدہ عظمتوں کا خیال آئے
میں جس تصور کی شمع رنگیں سلیم دل میں جلا رہا ہوں
یہی تمنا ہے وقت کی آندھیوں کے ہاتھوں وہ بجھ نہ جائے

مجھے حوادث کی برق سامانیوں کا خوف و خطر نہیں ہے
کہ زندگی ہے تو زندگی کے غموں سے ہرگز مفر نہیں ہے
مری دعا میں اثر نہیں ہے مری نوا کارگر نہیں ہے
مگر ترا غم ہے روز افزوں کمی کہیں ذرّہ بھر نہیں ہے
یہ میکدہ ہے، یہ میکدہ ہے جو ہو سکے تو ذرا ٹھہر جا
کہ اس سے آگے کوئی مقامِ علاجِ دردِ جگر نہیں ہے
نہ ہوگی توہینِ ضبط اے دل کسی طرح بھی مجھے گوارا
ہزار صدمے اٹھا رہا ہوں مگر مری چشم تر نہیں ہے
میں تیرے جلووں میں کھو گیا ہوں نگاہ گم ہے تجلیوں میں
تری تجلی کی موج بن کر مری نظر اب نظر نہیں ہے

———

تری نظر سے اگر بات ہو نہ پائے گی
حیات وقفِ خرابات ہو نہ پائے گی
یہ اضطرابِ مسلسل یہ اپنی بے تابی
رہینِ گردشِ حالات ہو نہ پائے گی
اجڑ رہا ہے کچھ اس طرح زندگی کا چمن
کہ جیسے اب کوئی برسات ہو نہ پائے گی
یہ دل کی آگ یہ روحِ وفا کی تشنہ لبی
تمھارے پیار سے بھی بات ہو نہ پائے گی
اگر فریبِ نظر پر رہا مدارِ وفا
تو پھر دلوں کی کوئی بات ہو نہ پائے گی

سب سے غافل ہے اور سب کی خبر
حسن سے کم نہیں ہے حسنِ نظر
اک زمانہ تھا درمیاں ورنہ
دو قدم پر تھی تیری راہ گذر
کیا زمانہ بدل گیا اے دوست
یا بدل ہی گئی تمھاری نظر
ایسے لمحاتِ غم بھی گذرے ہیں
جن کی دل کو بھی ہو سکی نہ خبر
ہے کبھی زیست نغمۂ عشرت
اور کبھی ہے یہ رقصِ برق و شرر
جلوۂ حسنِ بے نیاز کی خیر
آج ہے امتحانِ قلب و نظر

نور و نکہت کی کوئی بات کریں
دور تاریکیٔ حیات کریں
آ کہ سارے جہاں پہ چھا جائیں
آ کہ تسخیرِ کائنات کریں
زلفِ ہستی سنوارنا ہے ہمیں
آپ کچھ چشمِ التفات کریں
آرزو جانِ زندگی ہے سلیمؔ
کس طرح ترکِ خواہشات کریں

شہ رگ سے بھی قریب وہ جانِ سرور تھا
لیکن مری نظر سے بہت دور دور تھا
کیا تم تھے دل میں یا کوئی نشتر چبھا ہوا
کیوں اتنا بے قرار دلِ نا صبور تھا
یہ اور بات ہے کہ کسی نے جفا بھی کی
ورنہ خیالِ اہلِ محبت ضرور تھا
میں نے ہی تجھ سے بڑھ کے لگائیں توقعات
تو کس لیے خجل ہے مرا ہی قصور تھا
تیرہ شبیٔ غم کدۂ زیست سب درست
لیکن ہمارے ساتھ محبت کا نور تھا
کس نے مری نظر کو دکھائے ہزار رنگ
کس کے جمالِ شعبدہ گر کا ظہور تھا
دنیا سلیم ایک جہنم سے کم نہ تھی
دیکھا جسے بھی درد و مصیبت سے چور تھا

جب بھی لمحات زرفشاں نہ رہے
مہرباں اپنے، مہرباں نہ رہے
یا بتوں میں وہ بات ہی نہ رہی
دوستو! یا ہمیں جواں نہ رہے
آشیاں آشیاں سہی لیکن
کاش یہ فکرِ آشیاں نہ رہے
یا بہار آشنا نہ ہو گلشن
یا پھر اندیشۂ خزاں نہ رہے
یا تو مٹ جائے یہ جبینِ ناز
یا ترا سنگِ آستاں نہ رہے
میکدے میں چمن میں صحرا میں
غم کے مارے کہاں کہاں نہ رہے
عشرتِ بزمِ دوستاں میں سلیم
حیف اگر یادِ رفتگاں نہ رہے

حسن کا جذبہ نگاہِ دل نشیں تک ہی نہیں
اور بھی کتنی ادائیں ہیں یہیں تک ہی نہیں

کیفِ سجدہ تو سراپا سجدہ بن جانے میں ہے
سر سے پا تک سجدہ بن، سجدہ جبیں تک ہی نہیں

کتنی آہیں ہیں کہ دل میں گھٹ کے رہ جاتی ہیں دوست
بیکسوں کی آہ، آہِ آتشیں تک ہی نہیں

تو اگر چاہے تو دنیا کو بنا ڈالے بہشت
عیشِ بے اندازہ فردوسِ بریں تک ہی نہیں

نشترِ انکار ہے اقرار کی صورت لیے
اف ترا انکار وابستہ نہیں تک ہی نہیں

آج رگ رگ میں خلش محسوس ہوتی ہے سلیم
اب محبت کی خلش دل کے قریں تک ہی نہیں

جب بھی بکھرا گلوں کا شیرازہ
کھل اٹھے کتنے ہی گل تازہ
اب بھی ہے تیری یاد رونقِ زیست
اب بھی ہے باز دل کا دروازہ
اشکِ غم کون روک سکتا ہے
عشرتوں کا یہی ہے خمیازہ
دل کی گہرائیوں میں اترے کون
کس کو ہے کس کے غم کا اندازہ
دل کی آواز پر چلے ہیں ہم
کیوں کسے ہم پہ کوئی آوازہ
خونِ دل سے ہے زندگی کی نمود
روئے ہستی کا ہے یہی غازہ
ہم کو خود بھی سلیم ہو نہ سکا
اپنی محرومیوں کا اندازہ

بزمِ جاناں کے میگسار ہیں ہم
مستِ صہبائے چشمِ یار ہیں ہم
دیکھنے میں ہیں زندہ دل لیکن
مرکزِ رنجِ روزگار ہیں ہم
اب خزاں کا خیال تک بھی نہیں
کتنے مستِ مئے بہار ہیں ہم
حاصلِ زندگی ہے تیرا غم
اور ترے غم کا اعتبار ہیں ہم
کوئی تسکیں کوئی سکون نہیں
جانے کیوں اتنے بیقرار ہیں ہم
ہم سے ہے رونقِ حیات سلیم
بزمِ ہستی کے شہریار ہیں ہم

عشرتِ زندگی کہاں نہ ملی
دل کے ہاتھوں مگر اماں نہ ملی
سہہ چکے ہر عذابِ ناگاہی
عشرتِ مرگِ ناگہاں نہ ملی
عمر بھر تیری آرزو کرتے
فرصتِ شوقِ ناگہاں نہ ملی
شرحِ غم اہلِ غم سے ہو نہ سکی
ایک سے ایک داستاں نہ ملی
جو گذاری تری محبت میں
پھر وہی عمرِ رائگاں نہ ملی
کون جانے کہ دل پہ کیا گذری
فرصتِ آہ بھی جہاں نہ ملی
جذبۂ شوقِ بیکراں تھا سلیم
کہ ہمیں عمرِ جاوداں نہ ملی

عشرتِ زندگی کہاں نہ ملی
دل کے ہاتھوں مگر اماں نہ ملی
سہہ چکے ہر عذابِ ناگاہی
عشرتِ مرگِ ناگہاں نہ ملی
عمر بھر تیری آرزو کرتے
فرصتِ شوقِ ناگہاں نہ ملی
شرحِ غم اہلِ غم سے ہو نہ سکی
ایک سے ایک داستاں نہ ملی
جو گزاری تری محبت میں
پھر وہی عمرِ رائگاں نہ ملی
کون جانے کہ دل پہ کیا گزری
فرصتِ آہ بھی جہاں نہ ملی
جذبۂ شوقِ بیکراں تھا سلیم
کہ ہمیں عمرِ جاوداں نہ ملی

تھا محبت کا وہ بھی اک عالم
ہم تھے رنجیدہ اور تم برہم
زندگی سے نہیں ہیں ہم مایوس
اے مرے دوست اے مرے ہمدم
تیری نظروں میں تیرا اپنا دکھ
میری آنکھوں میں اک جہاں کا غم
ہم رہیں گے خموش ان کے حضور
لیکن اپنا یہ دیدۂ پُرنم
دل کی آزردگی ندیم نہ پوچھ
ہر گھڑی ٹوٹتے ہیں تازہ ستم
دل ہے اور غم کی کائنات سلیم
ہم ہیں اور بے بسی کا اک عالم

رازداروں نے دکھ دیے ہیں بہت
خام کاروں نے دکھ دیے ہیں بہت
تم نہیں تھے تو موسمِ گل میں
لالہ زاروں نے دکھ دیے ہیں بہت
شبِ مہتاب میں نہ جانے کیوں
چاند تاروں نے دکھ دیے ہیں بہت
ستمِ غیر کی شکایت کیا
اپنے پیاروں نے دکھ دیے ہیں بہت
جو بھنور بن کے سامنے آئے
ان کناروں نے دکھ دیے ہیں بہت
جن سے نظریں فریب کھاتی رہیں
ان سہاروں نے دکھ دیے ہیں بہت
غم گساروں کی بات رہنے دے
غم گساروں نے دکھ دیے ہیں بہت

جاگ اٹھی جہاں تمھاری یاد
ان نظاروں نے دکھ دیے ہیں بہت
ماہ پاروں کی بات کون کرے
ماہ پاروں نے دکھ دیے ہیں بہت
جو ہمیں دیکھ کر سمٹ سی گئیں
ان بہاروں نے دکھ دیے ہیں بہت
حسنِ معصوم کا تو ذکر ہی کیا
پختہ کاروں نے دکھ دیے ہیں بہت
جن کو کلیاں سمجھ رہے تھے سلیم
ایسے خاروں نے دکھ دیے ہیں بہت

اشکوں سے آستیں کو بھگوئے ہوئے سے ہیں
پھر آج تیرے غم زد ہ روئے ہوئے سے ہیں

ہم مضمحل ہیں آج کہ تو ہے اداس اداس
فتنے تری نگاہ میں سوئے ہوئے سے ہیں

ساحل تک آگئے ہیں مگر اس کے باوجود
گرداب میں سفینہ ڈبوئے ہوئے سے ہیں

دنیا کا ہے خیال نہ عقبیٰ کی فکر ہے
کیا جانے کس خیال میں کھوئے ہوئے سے ہیں

کیا تجھ کو ہے کسی نئے بسمل کی پھر تلاش
دامن کے جتنے داغ ہیں دھوئے ہوئے سے ہیں

کتنے ہی پھول کتنی ہی کلیاں چنیں مگر
رگ رگ میں نوکِ خار چبھوئے ہوئے سے ہیں

ٹھہرے ہوئے سے ہیں سرِ مژگاں شریکِ غم
لعل و گہر نظر میں پروئے ہوئے سے ہیں

ماضی کے حادثات محبت کے واقعات
غم بن کے میرے دل میں سموئے ہوئے سے ہیں

تجھے گلہ کہ محبت سے مجھ کو مس ہی نہیں
مجھے یہ فکر کہ کیوں زندگی میں رس ہی نہیں
فلک بھی عظمت انساں کے گیت گاتا ہے
یہ مت کہو کہ ستاروں پہ دسترس ہی نہیں
ابھارتا ہے جو پس ماندگانِ منزل کو
نویدِ قربتِ منزل بھی ہے جرس ہی نہیں
ہمیں حیات کی موجیں ہمیں ہیں بحرِ ممات
ہماری زیست فقط ایک دو نفس ہی نہیں
قدم قدم پہ گلستاں میں بچھ رہے ہیں دام
قفس ہیں اور بھی صیاد کا قفس ہی نہیں
مذاقِ دید پہ ہے منحصر وگرنہ سلیم
چمن میں بلبل و گل بھی ہیں خار و خس ہی نہیں

وہ کیوں ہمیں بلائیں
اے دل چلو مل آئیں

دل دور ہو گیا ہے
کیسے قریب آئیں

کچھ دیر ہو سکے تو
غم کی ہنسی اڑائیں

محفل تری سلامت
ہم آئیں یا نہ آئیں

کتنے فریب کھائے
کتنے فریب کھائیں

کیا خوب ہو کہ تم سے
ہم بھی نظر بچائیں

کچھ تم قریب آؤ
کچھ ہم قریب آئیں

محشرؔ سلیم کیا ہے
دیکھیں تری ادائیں

جب کبھی پھیل گئے اندھیارے
سرِ مژگاں اتر آئے تارے
آپ اپنے پہ بھروسا نہ رہا
اجنبی نکلے جو اپنے پیارے
یوں خرابات سے دامن نہ بچا
زندگی کے ہیں یہی گہوارے
جو کبھی دل میں اتر جاتے تھے
دل میں چبھتے ہیں وہی انگارے
تیری بیگانہ مزاجی کے سبب
حوصلے ٹوٹ گئے ہیں سارے
دل مسرت سے ہے محروم سلیم
یوں تو ہنس لیتے ہیں غم کے مارے

سرِشکِ غم کی زباں سے کب تک بیانِ دردِ نہاں کریں گے
زبانِ خاموش سے کہاں تک غمِ محبت بیاں کریں گے

ابھی تو یارائے ضبط باقی ہے جاں نثاروں کو غم دئے جا
ابھی تو ہوش و خرد ہے باقی ہم اس کا شکوہ کہاں کریں گے

بس اک جھلک کے عوض بھی کوئی اگر متاعِ حیات چاہے
تو اس کے قدموں پہ ہم نچھاور بصد خوشی نقدِ جاں کریں گے

بہار میں کھیلتے رہے ہم بہار کی دلفریبیوں سے
خزاں جب آئے گی گلستاں میں خزاں سے دل شادماں کریں گے

بہ فیضِ عشق و بہ فیضِ ہستی کچھ اس طرح کی صنم پرستی
کہ باغِ رضواں کی ہر روش پر خیالِ کوئے بتاں کریں گے

رہِ محبت پہ چلنے والے سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانا
بڑھا بڑھا کر جہان والے ہزار باتیں یہاں کریں گے

چمن میں پابندیٔ نشیمن، یہ ایک قیدِ قفس ہے ہمدم
ہم اپنی فطرت کو بے نیازِ ضرورتِ آشیاں کریں گے

اسی سے لطف و سرورِ ہستی، صنم پرستی، صنم پرستی
سلیم جب تک ہے جان باقی، طوافِ کوئے بتاں کریں گے

زندگی ربطِ عشرت و غم ہے
خندۂ گل ہے اشکِ شبنم ہے
گاہے ہستی ہے اک حقیقت سی
گاہے ہستی نظر میں مبہم ہے
کیوں نہ سجدہ اسی کے در پہ کریں
جس کا در سجدہ گاہِ عالم ہے
پینے والوں کے سامنے ساقی
کوئی ساغر ہو ساغرِ جم ہے
جان گھل جائے جس کی فکر میں دوست
ایسی جنت بھی اک جہنم ہے
کیا کوئی پھر بچھڑکے جاتا ہے
کیوں غمِ جان گداز کم کم ہے
کیا کہیں اب تو دل کا حال سلیم
ایک بے کیفیٔ مجسم ہے

کہیں یہ بات بھی اے دوست ناگوار نہ ہو
مگر میں کیا کروں جب تجھ پہ اعتبار نہ ہو
مجھے قرار انہی بے قراریوں سے ہے
مرے سکوں کے لیے کوئی بے قرار نہ ہو
مخالفت سے طبیعت کا جوش ابھرتا ہے
وہی فضا ہے مناسب جو سازگار نہ ہو
مرے نگاہ میں وہ عشق ہی نہیں ہمدم
جو مٹ سکے، جو زمانے میں پائیدار نہ ہو
وہ داغ دل جو مٹانے سے مٹ سکا نہ کبھی
ہمارے عہدِ محبت کی یادگار نہ ہو؟
جب ان کو پیار سا آئے ہماری وحشت پر
تو کس لیے ہمیں اپنے جنوں سے پیار نہ ہو
جو سہہ رہا ہوں اسے جی ہی جانتا ہے سلیم
مری طرح سے کوئی محوِ انتظار نہ ہو

پلادے زہر نہیں جبکہ انگبیں ساقی
کہاں تک اشک کریں جذبِ آستیں ساقی

لگادے آگ جو غم کے نہاں خانے میں
عطا ہو مجھ کو وہی جامِ آتشیں ساقی

کوئی تو بات ہے ہم فرش کے مکینوں کی
کہ رشک کرتے ہیں سب عرش کے مکیں ساقی

میں اور ان کو بھلا دوں مری مجال کہاں
میں اور ترکِ محبت نہیں نہیں ساقی

کہاں کہ دردِ مجسّم تھا دل محبت میں
کہاں کہ درد ہے لیکن کہیں کہیں ساقی

زمانہ مائلِ بغض و حسد سہی لیکن
ہمارے دل میں نہیں کوئی بغض و کیں ساقی

ہزار سجدے کیے دل ہی دل میں ہم نے مگر
کسی کے در پہ جھکائی نہیں جبیں ساقی

ترا سلیم غزل خواں ہے بزم میں امشب
وجہِ ترانہ ترا قربِ اوّلیں ساقی

وہ نگاہِ شوق سے کچھ دور ہو سکتے نہیں
لاکھ پردوں میں چھپیں مستور ہو سکتے نہیں
تیرا غم کیا مل گیا گویا دو عالم مل گئے
دو جہاں کھو کر بھی اب رنجور ہو سکتے نہیں
داغ رہ رہ کر ابھرتے ہیں دلِ ناشاد کے
ہمنشیں کیا دور یہ ناسور ہو سکتے نہیں
ان کی نظروں سے جنھوں نے پی ہے وہ مدہوشِ عشق
بادۂ گلرنگ سے مخمور ہو سکتے نہیں
یہ تو مانا عشق میں مجبور ہیں لاچار ہیں
پھر بھی تم چاہو تو ہم مجبور ہو سکتے نہیں
جو کسی کے غم اٹھانے میں ہمیشہ شاد ہوں
وہ مسرّت پا کے بھی مسرور ہو سکتے نہیں
دیکھ لیتے ہیں انھیں دل کی تجلّی گاہ میں
ہم گدائے جلوہ زارِ طور ہو سکتے نہیں

سکوت کا یہی عالم رہا تو کیا ہوگا
کچھ عرضِ حال نہ اظہار مدعا ہوگا
کمالِ تلخیِ غم کم تو کیا سوا ہوگا
اگر جنونِ محبت سے دل رہا ہوگا
نظر سے دور سہی دل سے دور کیا ہوگا
نفس نفس میں تو ہی تو چھپا ہوا ہوگا
ہمیں تو سوزِ محبت سے کام ہے اے دوست
وہ اور ہوں گے جنھیں ذوقِ ماسوا ہوگا
نہ جانے کیوں یہ جہاں مجھ سے ہوگیا برہم
جنوں میں لب پہ ترا نام آ گیا ہوگا
ہزار راہ الجھتی اسی سے ہو لیکن
نشانِ راہ مگر پر بہ نقشِ پا ہوگا

ہر تمنا عذاب ہو کے رہی
زندگانی خراب ہو کے رہی
نگہِ اشتیاق کیا کہنا
آخرش کامیاب ہو کے رہی
اللہ اللہ فزونیِ بیداد
ایک دن بے حساب ہو کے رہی
مستیِ چشمِ ناز کیا کہنا
اشکِ جامِ شراب ہو کے رہی
حسن نے جو نگاہ کی دل پر
جانِ صد اضطراب ہو کے رہی
ہر ادائے خرد شکن تیری
دہر میں لاجواب ہو کے رہی
ہم سے چھپتی کہاں تجلیِ دوست
ہر طرف بے نقاب ہو کے رہی

ہر ایک مرحلۂ غم ہمیں گوارا تھا
کہ دل میں تو تھا نظر میں ترا نظارا تھا
وفائے حسنِ گریزاں پہ تکیہ کیا کرتے
کہ یہ بھروسا تو اڑتا ہوا سہارا تھا
چلے تھے میکدۂ عاشقی سے ہم جس دم
کسی نے درد سے شاید بہت پکارا تھا
رہا جراحتِ دل کا بہت دنوں یہ سماں
کہ برگِ گل بھی ہمیں مثلِ سنگ خارا تھا
جنوں میں دست و گریباں ہوا کیے باہم
وگرنہ حسن ہر اک اہلِ دل کو پیارا تھا
شبِ فراق تو موجِ ہوا میں بھی تھی جلن
کوئی ستارا بھی چمکا تو اک شرارا تھا
چھڑا رہا ہے غمِ عاشقی سے اب دامن
سلیم دل تو کبھی اس طرح نہ ہارا تھا

تیری نظروں کا جب اشارہ پائیں
کیسے دانستہ ہم فریب نہ کھائیں
تم تو ہم کو بھلائے بیٹھے ہو
اور اگر ہم بھی تم کو بھول ہی جائیں
ہم کو بربادیوں کا رنج نہیں
آپ ہم سے مگر نظر تو ملائیں
ہم بھنور سے نکل ہی آئیں گے
اہلِ ساحل نہ اپنی بزم بڑھائیں

زندگی تلخ ہے تو مت گھبراؤ
تلخیوں کو ہی خوشگوار بناؤ
عیشِ رفتہ کی کوئی یاد دلاؤ
کوئی بھولا ہوا فسانہ سناؤ
باتوں باتوں میں بڑھ نہ جائے گھماؤ
طول دے دے کے بات کو نہ بڑھاؤ
اپنی نظریں نہ بار بار جھکاؤ
وقت بھر دے گا میرے دل کے گھاؤ
ایسے درویش پھر نہ آئیں گے
اپنی محفل سے ہم کو یوں نہ اٹھاؤ
زیست پر چھا گئی ہے تاریکی
زلفِ شبگوں کو اپنے رخ سے ہٹاؤ
زندگی کس قدر اداس ہے آج
دوستو دکھ بھرے ترانے نہ گاؤ

ہم تو شعلوں سے کھیلتے ہی رہے
اپنا دامن جو ہو سکے تو بچاؤ
غمِ دوراں ہے یا غمِ جاناں
دل میں جیسے دہک رہا ہے الاؤ
بڑھ چلیں ظلمتیں بہت غم کی
بزمِ یاراں سجاؤ دھوم مچاؤ
میری ہر تمکنت میں اک شوخی
شوخیوں میں اداس اک ٹھہراؤ
کتنے ناکام ہیں سلیم یہاں
اپنی ناکامیوں کو بھول ہی جاؤ

ایک ایسی بھی جنبشِ تدبیر
ٹوٹ جائے یہ حلقۂ تقدیر

ماہ و انجم پہ بڑھ کے ڈالیں کمند
نہ رہیں بستِ آسماں کے اسیر

میری باتوں میں شانِ خاموشی
اور خموشی میں لذّتِ تقریر

تیرے جلوؤں کی زد میں ایک جہاں
تیری زلفوں کا اک زمانہ اسیر

غمِ دوراں پہ ہنسنے والوں نے
تیرے غم کو بھی کر لیا ہے اسیر

ہم نے اس زندگی سے کیا پایا
اک زمانہ خفا ہے تو دل گیر

کچھ غلط فہمیاں ہوئیں ورنہ
تم بھی معصوم ہم بھی بے تقصیر

دل نے ایسے بھی غم اٹھائے سلیم
جن کی کوئی نہ ہو سکی تفسیر

ہمارے لہجے میں گو تلخیٔ حیات بھی تھی
مگر نظر میں محبت کی کائنات بھی تھی

حجابِ قربت و دوری اٹھے ہوئے سے تھے
تمھارے ہجر کی راتوں میں ایسی رات بھی تھی

تری جفا ہی میسر نہ تھی محبت میں
ستم زدوں پہ تری چشمِ التفات بھی تھی

ہمیں پہ سعیٔ محبت کا انحصار نہ تھا
تلافیٔ غمِ ہستی تمھارے ہاتھ بھی تھی

سمجھ رہے تھے مسرت کو جاوداں لیکن
بہت قریب سے دیکھا تو بے ثبات بھی تھی

غمِ حبیب سے ہی زندگی نہ تھی معمور
اسی میں دوزخ و جنت کی کائنات بھی تھی

سلیم گردشِ حالات کی حکایت میں
ہمارے عشق کی دلدوز واردات بھی تھی

جلوۂ گل نے حسنِ گلشن نے
اک نہ اک دلکشی نے لوٹ لیا
خامشی کے مہیب صحرا میں
لذتِ محتگی نے لوٹ لیا
چاندنی ایک نغمۂ خاموش
دل کو اس نغمگی نے لوٹ لیا
راہبر راہزن سہی لیکن
ہم کو در ماندگی نے لوٹ لیا
فرصتِ عیش جب سلیم ملی
ذوقِ آوارگی نے لوٹ لیا

متفرقات☆

ترے بغیر فضا سازگار ہو نہ سکی
تلافیٔ ستمِ روزگار ہو نہ سکی

☆☆☆

سکوت ہی میں رہی گم حکایتِ شبِ غم
مری نگاہ سے بھی آشکار ہو نہ سکی
نہ پوچھ فتنۂ محشر جگا گئی کیا کیا
وہ اک نظر جو مرے دل کے پار ہو نہ سکی

☆☆☆

سئے ہیں زخمِ جگر اور سی رہے ہیں ہم
بہر طریق جئے اور جی رہے ہیں ہم
طبیعت ماورائے کفر و ایماں ہے جہاں میں ہوں
عروسِ آدمیت جلوہ ساماں ہے جہاں میں ہوں

☆☆☆

ہجومِ غم میں مرے دل کی پاسباں تھی کبھی
وہ اک نظر جو محبت کی ترجماں تھی کبھی

☆☆☆

تری فغاں نہ کسی پر گراں گذر جائے
سنبھل سنبھل کہ محبت کی بارگاہ میں ہے

☆☆☆

سیاہ خانۂ غم میں یہ کون آیا ہے
دلِ فسردہ کا ہر داغ جگمگایا ہے
بہت سے رنج اٹھا کر یہ بھید پایا ہے
کہ جس کو عیش سمجھتے تھے غم کا سایا ہے
ہزار بار ترے غم میں کھو گئے ہیں ہم
ہزار بار ترے غم سے جی چرایا ہے
غمِ زمانہ کو دی ہے قدم قدم پہ شکست
ہر ایک گام ترے غم نے دل بڑھایا ہے

☆☆☆

یہی تھا غم کہ ترا دل نہ ٹوٹ جائے کہیں
لبوں پہ آ کے رکی ہیں کہانیاں کیا کیا

☆☆☆

لطف کیا دے گی انھیں ٹوٹے ہوئے دل کی صدا
نغمہ کب رہتا ہے کیف آ گیں شکستہ ساز کا
دی اسیرانِ قفس نے جان پر کھولے ہوئے
سامنا کرتے کہاں تک حسرتِ پرواز کا

☆☆☆

بہہ رہے ہیں اشکِ غم آنکھوں سے اور کوئی نہیں
جو کہے ان آنسوؤں کو دامنِ دل میں سنبھال

☆☆☆

نوکِ ہر سبزہ پر ایک ننھا سا سورج تڑپتا ہوا جگمگاتا ہوا
سینۂ آبِ سیّال آئینے کی طرح پیہم تجلّی دکھاتا ہوا
آب جو نرم و نازک حسیناؤں کے جسم کی طرح پیہم تھرکتی ہوئی
ایک اک شاخ اشجار کی ہر طرف شاخِ گل کی طرح سے لچکتی ہوئی

☆☆☆

ادا و ناز دکھا کر نہ دل میں آگ لگا
یہ آگ خرمنِ تمکیں کو پھونک دیتی ہے
نظر نظر سے ملا کر نہ دل پہ برق گرا
یہ برق عقل کے آئیں کو پھونک دیتی ہے

یہ ناز وعشوہ، حیا کی یہ سادہ پرکاری
ہے عزمِ غارتِ جاں بھولپن کے نام سے کیوں

☆☆☆

یہی تو ہوگا کہ لوگ اور خوار دیکھیں گے
پھر ایک بار تجھے ہم پکار دیکھیں گے
کبھی تو ہوگا مداوائے بے کسی اے دل
کبھی تو زورِ خوش و سازگار دیکھیں گے
یہ اور بات کہ ہونٹوں پہ جان آئی ہے
پئے تو اور شب انتظار دیکھیں گے
اگرچہ خون ہی رستا ہے زخمِ دل سے ابھی
وہ رخ وہ گیسوئے مرہم شعار دیکھیں گے

☆☆☆

کسی ویرانے میں تسکینِ دلِ زار ملے
اپنے سائے سے کوئی سایۂ دیوار ملے
دل اگر تیرا حقیقت میں ہے اخلاص طلب
میری آغوش میں آجا کہ تجھے پیار ملے
جب زمانہ پئے آزار ہے تو چپ کیوں ہے
اس سے بہتر ہے کہ تجھ سے کوئی آزار ملے
لذتِ وصل ادھوری ہے بدن تک ہو اگر
وصل تو جب ہے کہ افکار سے افکار ملے

مقامِ دار و رسن ہم سے جب بلند ہوا
ستم گروں کا خیالِ ستم دو چند ہوا
صلیب و دار کے وہ بھی ہیں مدعی کہ جنھیں
ہر اک مقام جو گل پوش تھا پسند ہوا

☆☆☆

قتل گاہِ آبرو ہر کوچہ و بازار ہے
اور اگر بچ کر چلے کوئی صلیب و دار ہے
زندگی فن ہے اور اس کا اک نہ اک معمار ہے
ہر قدم پھر کس لیے گرتی ہوئی دیوار ہے

☆☆☆

وہ جو کہتے ہیں کہ ڈھونڈھے سے خدا ملتا ہے
ان کو اس جھوٹ سے کیا جانیے کیا ملتا ہے
سلسلہ گیسوئے پیچاں نے بڑھایا اتنا
کہ ہر اک حلقہ اسی زلف سے جا ملتا ہے
دولتِ وصل جو ہاتھ آئے تو حاصل ہے یہی
کیا وگرنہ صلۂ مہر و وفا ملتا ہے
ہم ہیں غواصِ دل بیدرد سلیم
جب بھی ملتا ہے بظاہر وہ خفا ملتا ہے

بچھڑے تو جب بھی سلسلۂ این و آں میں تھے
پہلو عجب عجب خلشِ رائگاں میں تھے
جب تک تھا اس نظر کا سہارا زمیں نہ تھی
جیسے کہ ہم ورائے فلک، آسماں میں تھے

☆☆☆

غزل ہے سینہ زنی میرکی نہ فانی کی
غزل صدا ہے محبت کی ہم زبانی کی
کنارے لگ کے سسکتی ہے موج بھی کیا کیا
اسی تڑپ میں کہ فرصت ہو پھر روانی کی
اسی میں ہے رمِ آہو کا سا قرار و فرار
جس اضطراب نے چاہت کی ترجمانی کی
عجب بہار ہے رخسار پہ بہ رنگِ حیا
عجیب لہر ہے یہ لذتِ جوانی کی

☆☆☆

ہرنیوں کے لبوں پہ ذکرِ غزل
غم کے صحرا میں ہے عجب جل تھل
آسماں پر جھکی جھکی سی گھٹا
پھیلا پھیلا سا اک حسیں آنچل

باہر کی سمت جا کے نظر لوٹتی رہی
سسکی جو لی ہوا نے تو جاں پر بنی رہی
اک جانِ ناتواں کو اداؤں پہ دھر لیا
پھر دیر تک حسین لبوں پر ہنسی رہی
دنیا وہی ہے کوچۂ و بازار ہیں وہی
تو نے جو مجھ کو چھوڑ دیا کیا کمی رہی

☆☆☆

خیالِ سجدہ گہِ نقشِ پا نہیں جاتا
مگر ستم ہے کہ سجدہ کیا نہیں جاتا
سوائے آئینہ اے محوِ جلوہ آرائی
کوئی بھی تیرے مقابل کے نہیں جاتا
ہزار صدمے سہے ہیں مگر یہ عالم ہے
کہ تیرے ہجر کا صدمہ سہا نہیں جاتا
بس اک نگاہ کہ بسمل ہیں تیرے سب بسمل
تری نظر کا نشانہ خطا نہیں جاتا
کسی سے ترکِ تعلق ہزار ہو لیکن
سلیم ترکِ محبت کیا نہیں جاتا

ہر آرزو کا خوں بتِ آشفتہ خو نہ کر
دل کی نگاہ میں مجھے بے آبرو نہ کر
گر ہو سکے تو حسنِ حقیقت دکھا مجھے
دل کو خرابِ شعبدۂ رنگ و بو نہ کر
تجھ کو ملی جو چشمِ حقیقت نگر نہیں
پھر جستجو بھی خام ہے یوں، جستجو نہ کر
یہ داغ اپنے اشکِ ندامت سے دھو کے دیکھ
اس پاک دامنی کے لیے شست و شو نہ کر
لے بارگاہِ حسن میں خاموشیوں سے کام
یعنی بہ طرزِ عام کوئی گفتگو نہ کر
جب تک کوئی نظر سے پلائے نہ جامِ عشق
دل کو رہینِ بادہ و جام و سبو نہ کر
جب لطف ہے سلیم کہ ہمراہ ہو کوئی
تنہائیوں میں سیرِ لبِ آبِ جو نہ کر

☆☆☆

شرارِ غم سے جو روشن کیے خوشی کے چراغ
تو روشنی میں تھے یکتا یہ آگہی کے چراغ
سبھی ہیں مادرِ گیتی کے بے بہا فرزند
جلائے جائیں گے ہم مہرِ باہمی کے چراغ

☆☆☆

لوگ اک خوش الحاں کو
لائے ہیں گلستاں کو
گل کے بدلے خار آئے
چھیدتے ہیں داماں کو
ہر طرف سے گھیرا ہے
مجرموں نے انساں کو
کتنے خوبرو ہر سو
بیچتے ہیں ایماں کو

☆☆☆

کچھ ایسی صورتیں بھی ہر قدم آئیں نظر ہم کو
کہ ہر صورت میں اک تصویرِ رستاخیز دیکھی ہے
لب و ابرو کی جنبش ہو کہ زلفوں کا تموج ہو
کسی کی جو ادا دیکھی ہوس انگیز دیکھی ہے

☆☆☆

پسِ نگاہ ہے کیا ظالموں کے بس میں نہیں
جو ہم قفس میں ہیں فکر و نظر قفس میں نہیں
ہوئے ہیں پا بہ سلاسل جو ہم تو کیا غم ہے
کمی تو قافلۂ عشق کے جرس میں نہیں
اٹھی ہے گلشنِ ہستی میں سرخ سرخ آندھی
جو روک پائے مجال ایسی خار و خس میں نہیں

☆☆☆

تری دلچسپیاں کیا ہیں وہ سب کی سب سنوں تجھ سے
مری کیا خواہشیں ہیں ایک اک کرکے بتاؤں میں
تری قامت صنوبر سے ہے دلکش تر تو کیا حاصل
یہی مصرف نکل آئے کہ سینے سے لگاؤں میں

☆☆☆

آج پھر گردشِ دوراں مجھے لے آئی ہے
اسی کوچے میں جہاں چین کے دن رات کٹے

☆☆☆

فارسی کلام

از نتیجۂ فکر: ڈاکٹر سلیم واحد سلیم
نظر ثانی: علامہ کوثر صدیقی

دیدۂ تر را حریفِ ابرِ نیساں کردہ ایم
بیں چہ گوہرہا نثارِ یادِ جاناں کردہ ایم

ما کہ از جمعیتِ خاطر شناسا نیستیم
ربطہا پیدا بہ آں زلفِ پریشاں کردہ ایم

او ہزاراں عہد و پیاں کرد و ہم یادش نہ ماند
دل بہ ایں نازد کہ با او عہد و پیاں کردہ ایم

بر مژہ کردیم روشن گوہرِ شب تابِ عشق
خوش بیا کز بہرِ تو جشنِ چراغاں کردہ ایم

جز وفا در مہرِ تو از ما دگر کاری نہ شد
ایں اگر جرم است ما جرمِ فراواں کردہ ایم

زاں کہ خوش بودن بہر طورے کہ ی باشد خوش است
خندہ ہائے گردشِ گردونِ گرداں کردہ ایم

زانکہ یابد از خطرہا طبعِ ما آرام ہا
موجہ ہائی را کہ بر خوردیم طوفاں کردہ ایم

یک دی آسودہ ننشستیم از جوشِ جنوں
اشکِ خونیں دشت و صحرا را گلستاں کردہ ایم

ما بہ فیضِ محفلِ اربابِ دانش اے سلیم
خاکِ ارضِ خوش را ہمرنگِ ایراں کردہ ایم

حاصلِ عمرِ رواں گم کرده ام
من نشانِ کارواں گم کرده ام
گشته ام رسوائے مہرِ مہ وشاں
دین و دنیا بی گماں گم کرده ام
قوتِ دم در کشیدن ہم کہ نیست
طاقت و تاب و تواں گم کرده ام
اے عزیزاں کشته ام تاراجِ غم
راحت و آرامِ جاں گم کرده ام
جز رہِ تو ہیچ راہے یاد نیست
راہِ کوئے دیگراں گم کرده ام
بی تو در گلشن خزاں آید نظر
در گلستاں، گلستاں گم کرده ام
کس ندانست آرزوئے من سلیم
رشتۂ شرحِ بیاں گم کرده ام

☆☆☆

نہ ماند دل مگر آتش بہ قلب و جاں باقیست
تمام سوختم و برقِ بی اماں باقیست
ز فصلِ گل کہ بسی بہتر است نقشِ گل
گذشت عہدِ جوانی و عکسِ آں باقیست
ہزار نشترِ بیگانگی بہ دل خوردیم
مگر ہنوز ہماں مہرِ دوستاں باقیست
سپرد گورِ غریباں چہ میکسارانند
اگرچہ میکدہ ہم ہست و ہم مغاں باقیست

بتِ من رقص کناں چوں دهدم دست به دست
گلستاں رقص کند لاله و گل گردد مست

توبه کردم ز مئے و جام و سبو بشکستم
جانِ من یک نگهت باز مرا توبه شکست

اے کی می خندی و از حالتِ ما می پرسی
خنده ات چوں نوکِ نشتر به جانم پیوست

فقط از کم نگهی خار اذیت بینی
ورنه در گلشنِ هستی گلِ عشرت هم هست

بگذر از قصهٔ غم اے دلِ رنجیدهٔ من
بشود همتِ عالی ز مصیبت ها پست

هوشیار اے دلِ دیوانهٔ دیدار طلب
بگذاریم رود دامنِ امید ز دست

آں که از محتسب و شیخ ندارد پاکی
منم آں باده پرست و منم آں مست است

بی خطر رخ سوئے منزل چو نهادیم سلیم
هیچ اندیشه نه داریم چه بالا و چه پست

ندارد ہیچ کس جوشِ تمنائی کہ من دارم
ولے ہچوں دلِ بیتاب و شیدائی کہ من دارم
زعکسِ روئے تو گلگوں اشکِ غم سرِ مژگاں
نظر آئینہ شد از جلوہ آرائی کہ من دارم
بجز شکلِ تو در دشتِ جنوں چیزی نمی بینم
خوشا ایں آرزوئے وحشت افزائی کہ من دارم
سخن ہای زند حرفے ولے از دل نمی راند
بود بیگانہ بہتر از شناسائی کہ من دارم
شرابِ زندگی نوشم، دمادم پے بہ پے نوشم
ولے تشنہ است روحِ بادہ پیمائی کہ من دارم
ز آہِ شعلہ افشانم شبِ تاریکِ من روشن
ولے جانم نہ سوزاند توانائی کہ من دارم

تو اے حسنِ جنوں پرور کہ افسونِ ادا داری
بہ ہوشند اہلِ دنیا زانکہ اندازِ حیا داری

شکایت ہائے یارانِ زمانہ می کنی لیکن
بہ بیں یک لحظہ خود را ہم کہ با کس تو وفاداری

کثافت ہائے دنیا زنگِ آئینہ شود از سیرِ اہلِ دل،
تجلی می شود ہر عکس اگر صدق و صفا داری

بہ ہر بزمی کی آئی مسندِ اول ترا باشد
کہ تو سمتِ توجہ می شوی ہر جا کہ جا داری

عیاں گردد اگر مکرِ تغلب کیش، می جنگد
چہ نفعی یابم از تو گر ترا گویم ریاداری

مسلسل سعیِ زندہ بودنِ ما زندگیِ ما
حیات از سیرِ تو عیشی کہ آن ہم پیشِ پا داری

نگہِ مہرِ بتاں قیمتِ جان و دلِ من
ہست از مذرعۂ زیست ہمیں حاصلِ من

مئے گلفام اگر زہرِ ہلاہل باشد
باز ہم ہست مداوائے دلِ بسملِ من

من کہ در جادۂ ہستی شدہ ام سرگرداں
تو کجائی کہ بگوئی بمن از منزلِ من

یک نفس ہم دلِ سوزندہ قرارے نہ گرفت
برقِ بیتاب سرشتند ز آب و گلِ من

تپشِ جاں ز وصالِ تو فرو بردہ نہ شد
از تو ہم سر نہ شدہ مرحلۂ مشکلِ من

چہ می شود پسِ آفاق ہا چہ می دانیم؟
کجا برد سفرِ ارتقا چہ می دانیم؟

چہ لُعبت است کہ در کسبتِ جہاں آید
ز بازی اش چہ بود ادّعا چہ می دانیم؟

صدائے بلبل و بوئے گلاب و تابشِ مہر
نہ آشناست کہ خود آشنا چہ می دانیم؟

نہ جوہر است عناصر دلے ہماں جوہر
وجودِ مطلقش آید کجا چہ می دانیم؟

ز دورِ جام و سبو است گردشِ مئے ناب
وگرنہ ماہیت وقت را چہ می دانیم؟

فقط تغیرِ قالب بفہم می آید
گُل از بِگل است بِگل از ورا چہ می دانیم؟

چگونہ ہست ز ہیچ است، اگر ہیچ است
چگونہ ہیچ شود ہست را چہ می دانیم؟

جہاں ز ما نہ بود ما جہاں نہاں باشیم
ز خاکِ نقش گُلے را جدا چہ می دانیم؟
ادائے نو بہ نو ایجادِ شوخیِ یار است
ز شوخی اش بنماید چہا چہ می دانیم؟
بروں ز عالمِ امکاں اگر بود چیزی
بروں ز جاست کہ او است جا چہ می دانیم؟
بنائے میکدہ خاک و سبو و ما ہم خاک
جز ایں قدر ہمہ مہر و وفا چہ ی دانیم؟
بہشت حسرتِ تعمیرِ عشرتِ نادار
نگارِ وہم و تمنا نما چہ می دانیم؟
سلیم حسنِ کسی را کہ در نظر داریم
حقیقت است کہ یک خوابِ ما چہ می دانیم؟

بے مثال است حال و احوالم
طرفہ صورت گر است اشکالم

فہم من آبجوئی ارضِ سخن
لعل و الماس شعر اموالم

ہم مثالِ ہما کنم پرواز
در اقالیمِ فکر می بالم

عطر بینش ہر آنکہ می بینم
جانِ دانش تمام اقوالم

تیرگی ہا بسی ہجوم نمود
باوجود یہ کہ مہر تمثالم

اے حریفانِ بادہ نوش آئید
غرۂ عید و ماہِ شوالم

رشکِ عرفی، طالب و غالب
ہم چو مہر زمین اقبالم
حیف صد حیف بر زمانہ سلیم
جگرم را خُورَد ہمیں بالم

بہرِ مظلوماں چو سر کردم فغانِ خویش را
سوئے کشمیر آوردم ایں ارمغانِ خویش را

از برہمن بچگاں ہشیار باشید اہلِ دل
نیک اندیشید در صحبت زیانِ خویش را

اے کہ از تو سرو و شمشادِ چمن رونق گرفت
یک زماں تابندہ تر کن گلستانِ خویش را

در نظر بازی چناں مانم بخوبانِ جہاں
چوں خروسی کو ببیند خاکیانِ خویش را

راست، از حرفِ تو ی گیریم مفہومِ دگر
خود نمی فہمی مگر طرزِ بیانِ خویش را

ماجرائے دل بہ الفاظِ تو میگوئیم و تو
ساکتی گویا کہ گم کردی زبانِ خویش را

روانہ است برافراشتہ نشان و علم
بسوئے وحدتِ اقوام کاروانِ امم
صدائے کوس ظفر شعر ماست بہرِ بشر
نوائے فتحِ نفس ہائے ماست در عالم
بیا کہ از قدمِ ما طریقِ نو پیداست
چو راہِ نُوست نشانی مجوز نقشِ قدم
ز آسماں من و سلوئ نہ می رسد نہ رسید
درونِ بت کدہ باشی کہ در حریمِ حرم
نتیجہ طبقِ مساعی مساوی اس مدام
ز سعیِ تست ہر اندازِ صورتِ عالم
رواں جہید ز گردابِ لذتِ اجسام
کہ آدمی خورد ایں چوں فرو مہند قدم
بجز مرادِ بشر در بہ ہر مراد بہ بند
ز حسن باصرہ باشد کہ شمعِ کہ شم

بہشت آں سوئے افلاک ہا نمی باشد
ز بطنِ خاک دمانید صد ہزار ارم
جفاگرانِ جہاں را بید در فطراک
بر آورید ز جا ہر کجاست تخمِ ستم
قدم زنید کہ مریخ و مشتری است قریب
کنیسہ وقع بر افلاک ہا ظلوم و ظلم
بہشتِ ارض بجو از مسیحِ عصر سلیم
ز فقرہ مثلِ یہودا بگیر چند درم

می شود اژدہا صفت چہرۂ خوش طراز را
زیر ز کتف ہا مکن زلفِ سیہ دراز را
از دہ لبانِ لعلِ خود لذتِ بے مثال دہ
کے بود ایں قدر کشش غنچۂ نیم باز را
راز نداشتیم ما، راز نبودہ ایم ما
می کشد و کشد چرا دہر حصولِ راز را
بخت چو منقلب شدہ، بجز مکن فغاں مکن
مثلِ شرار و شعلہ شو بزمِ نیاز و ناز را
غنچہ ز شاخ می فتد، برگ بہ باد می رود
م چہ کلیم از چمن کوششِ احتراز را
دورِ سکندری گذشت، صولتِ غزنوی گذشت
قصۂ نو بہ نو بگو، یاد مکن ایاز را

ماہِ رخِ دلدار بیائید و بہبیند
مہتاب بہ گلزار بیائید د بہبیند
ایں سروِ قد و ایں گُلِ رخ ایں ورقِ لب
سخت است چہ بیدار بیائید و بہبیند
پروانہ نباشید اگر، خوب نباشید
شمع است جنوں کار بیائید و بہبیند
داویم بدل جائے رسید انچہ ز گلشن
آغشتہ بخوں خاربیائید و بہبیند
ہر غنچۂ و گل آئینۂ یک دگری ہست
فاشِ عالمِ اسرار بیائید و بہبیند

در قفس ہستیم اکنوں آشیانِ ما کجاست
آشیانِ ما کجا و گلستانِ ما کجاست
باز می جوشیم از دردے ولے از فرطِ شوق
سیر و وصلِ دوست سعیِ رائگانِ ما کجاست
قصۂ دردِ محبت سر کن اے یارِ عزیز
داستانِ عیش و عشرت داستانِ ما کجاست
جان از تو روح از تو دل ز تو دنیا ز تو
ہر چہ ما داریم آنِ تست آنِ ما کجاست
از کجا آوردہ اند و از کجا افگندہ اند
ایں جہانِ ما نمی باشد، جہانِ ما کجاست
آں فدائے مہرِ بت ہائے تفنگ و شوخ و شنگ
آں سلیمِ خوش بیاں شیریں زبانِ ما کجاست

بہرِ ما خار گل و نیش زنی ہم بود است
ورنہ در شہر فراواں چمنی ہم بود است

دولتِ خانۂ من ہیچ نباشد جز من
مثلِ من شاعرِ درویش غنی ہم بود است

سنگِ طفلان و ملامت ز بزرگاں خوردیم
از منافق رفقا طعنہ زنی ہم بود است

انکہ در خانۂ من گرد و غبار است و ہوا
پیش ازیں جامِ مئے و گل بدنی ہم بود است

دار حقدار گہی بود گہی مقتل بود
بہرِ ما ہم رسنی، تیغ زنی ہم بود است

وہم صدہا شکل دارد، شکلِ او الہام ھم
در ضلالت ہا، جہالت ہا، شود ناکام کم

کور شد ہرکس ندید اندازِ کارِ ارتقا
سبزہ از خاک است و نرگس ہم بگِلِ بے نام ھم

گر شعوری د. شت گل، از شرم می شد موجِ آب
زیں حقیقت ہا کہ او را می شود با دام دم

بادہ کز چشمان و نوشی کز لبانِ او بَرم
یک مثالِ آتش است و دیگری گلفام ہم

دل طپیدن ہائے ما ہم از طپیدن ہائے تست
جامِ جم ہم ذرہ ہائے عالم است و جام ہم

منعدم گردد چو موجی طورِ نو گردد پدید
موجِ ما ہم بحر است و ہم صباح و شام یم

مہر و ماہ و مشتری ہم موج ہائے ہست و بود
ہم چنیں یک موج ہست ایں گردشِ ایام ھم

چوں کند وا دارِ جدّ و جہد بی اندازِ زیست
می برد اندر ضررہا حسرتِ ناکام کم

چوں غزالاں رم مکن در سبزہ زارِ زندگی
شیر شو تا بشکنی زنجیر ہا ھم دام ہم

برائے ما قدمی زد ولی بما نہ رسید
بکوچہ ہائے دگر رفتہ، بہ آشنا نہ رسید
نشانِ مسکنتِ طبع بی نوا یانست
ہماں کہ دستِ دعایست، ہیچ جا نہ رسید
ہوا وزید بسی و چمن دمید بسی
چہ شد کہ گ گلِ امیدِ ما صبا نہ رسید
غرورِ زہد بدل ہائے رنج حرمانست
جز ایں بہ چشمۂ حیوانِ اتقا نہ رسید

زمانہ ہر چہ بما کرد و می مند امروز
مثالِ اشک کند از دو چشمِ خویش بروز
مثالِ کرمکِ شبتاب در زمانہ متاب
مثالِ مہر جہاں‌تاب بہرِ دہر بسوز
مکن سکوت چمن را چو در خطر بینی
مدوز چاکِ نصیب و لبانِ خویش مدوز
حیا مکن ز درختانِ لخت دریائیز
بیا کہ با تو و با می خزاں شود نوروز
سلیم قدر زیادت شود پسِ ہر عصر
بمنزلی کہ رسد فہم ابتداست ہنوز

☆☆☆

گر یک شبے وصلتش دست داد
بگویم ز اسرار دولت زیاد
چو من شاملِ مستنداں شدم
نشاں داد او خوئے دولت زیاد
ہمیں قبلہ ام بود س من گفتہ ام
زرخسار روشن زیارت زیاد
جنونی گو کہ دست از آستیں بیروں نہد ما را
زند چاکی بجیب و خوش مند دامانِ صحرا را
جنونی گو کہ جولانی دید ذوقِ تماشا را
ز وسعت ہائے خود خجلت دہد دامانِ صحرا را
چناں بیلیم ہر بی مہریِ اربابِ دنیا را
کہ گوئی روشنیِ چشم رفت از چشمِ بینا را
صنوبر قامتی زیرِ چناری صحبتِ ما را
نمی خواہیم گلزارِ بہشت و نخلِ طوبیٰ را
چو یارانِ زمانہ اے زمانہ سازِ بی پروا
چہ نقصان آیدت بینی اگر یک یارِ تنہا را
بجز انبارِ حسرت ہیچ حاصل کے دہد شعری
بہ کشتِ عشقبازی کاشتن تخمِ تمنا را

☆☆☆

به چشماں وحدتِ انساں بدل مہر بشر دارم
برائے رفعِ ظلمت ہمرہ ام رنگِ سحر دارم
بصیرت باید ش او را کہ شعرِ نغز می گوید
کہ من در جذبۂ رنگیں متاعِ فکرِ تر دارم
اگر بادِ حوادث تند باشد سخت می کوشم
کہ من صدہا چراغ از رہگذارِ باد بردارم

☆☆☆

ز ضعفِ تن کہ عجزی نیست بیمارِ محبت را
کہ نتواند کشد بارِ گراں اربابِ صحت را

☆☆☆

صد نقش صنم خانہ گہی قبلۂ دیں ہم
افسونِ تجلّیش چنانست و چنیں ہم
از ظلمِ سفیدانِ سیہ قلب خروش است
صد غلغلہ برپاست ز بت خانۂ چیں ہم

☆☆☆

اگرچہ دیدنِ قیس از مشابہت بودست
رقیبِ چشمِ غزال است چشمِ لیلیٰ را
اگرچہ انجمِ تاباں نمی رود بہ شمار
کجا حساب شود ذرہ ہائے صحرا را

☆☆☆

خواہم که نفور باشم امّا
بنیاد براں نہاد نتواں
بحریست رواں محبتِ او
بندی برو ایستاد نتواں

☆☆☆

ہجومِ رنج و الم ہست و دل تنِ تنہا
بیا بمن که چه فرقت چه می کند با ما
ز یک نگاه که مضرابِ بربطِ جان است
ہزار نغمهٔ دیوانه ساز شد پیدا
مثالِ ابرِ بہاری ز گلستاں رفتی
در انتظارِ تو گلشن شده خزاں آسا
ہزار بار دلم را شکستی و رفتی
مگر نرفت ز دل نغمه ہائے مہرووفا
برائے اہلِ خرد ہر خرابه صحرا است
برائے اہلِ جنوں تنگ وسعتِ صحرا
تو اے که محوِ تماشائے گلستانستی
به از تبسمِ گل، شگفتنِ دل ہا
مثالِ ریگِ بیاباں فتاده ام در ره
صبا به لطف بگو آن غزالِ رعنا را

☆☆☆

مہر از مہر خاست می بینی
از وفا ہا وفاست می بینی
جوشِ ما کو به کو برو ما را
راهِ ما تا کجاست می بینی

☆☆☆

'حسن را جز پے بہ پے تغییر نتواں یافتن'
خواب را جز این علم تعبیر نتواں یافتن

خیز و تسخیرِ جہاں کن عالمی در پائے تست
دہر را ناقابلِ تسخیر نتواں یافتن

چوں حوادث پیش آید بشکنش با زور و عزم
از کماں ہای شکستہ تیر نتواں یافتن

دور دنیا رو مثالِ تند بادِ پر صدا
بہرِ طوفاں محبس و زنجیر نتواں یافتن

بال و پر بکشا کہ آفاق انتظارت کی کنہ
ایں ز کوشش یابی از تقریر نتواں یافتن

با محبت جان و دل ہائے بشر مربط کن
بہرِ وحدت بیش ازیں اکسیر نتواں یافتن

گر تو می خواہی خلوص، اخلاص خود در کار آر
این ز آہ و حرفِ بی تاثیر نتواں یافتن

جلوہ ہائے تست حسنِ تست رنگِ تست ہمہ

غیرِ تو آئینہ ہا تنویر نتواں یافتن

از نکو رویاں خراج از کنج کاوی می بریم

ایں فقط از نالۂ شب گیر نتواں یافتن

شش جہت را شہرتِ شعرت فرا گیرد سلیم

نکہتِ آوارہ چوں نخچیر نتواں یافتن

(ایں غزل بدونِ معذرت در جوابِ آن غزل بیدل نوشتہ ام کہ مقطعش این است" در حریم
کبریا بیدل رہِ قرب و وصول۔۔ جز بہ سعیِ نالۂ شبگیر نتواں یافتن)

نماند بادۂ نطقِ تو تشنگانِ تو ایم
کہ ما فریفتۂ لذتِ بیانِ تو ایم

چرا تو نوئے ملیحت نمودہ ای پنہاں؟
بیا کہ منتظر جلوۂ عیانِ تو ایم

چرا؟ چہ شد کہ بیک بارگی چناں رفتی
چرا گذاشتی ما را کہ ہم عنانِ تو ایم

بایں شتاب جدائی روا نبود ترا
ز ما کہ ہم قدم و اہلِ کاروانِ تو ایم

چہ بود رازِ چناں عجلت نگفتہ بماند
بما چرا تو نگفتی کہ داستانِ تو ایم

فرو نہیم کجا وز کجا ز سر گیریم
حکایت کہ بدل ہٗ ز داستانِ تو ایم

تو رفتہ ای و تیقن نمی کنیم ہنوز
بہ رہگذارِ تو جوئیدۂ نشانِ تو ایم

بسی زمانہ شنید و بسی ز تو گفتیم
ولے ہنوز در آغاز داستانِ تو ایم

تو زیرِ چادرِ خاک این چنیں چرا خفتی
بیا کہ منتظرِ حرفِ گل نشانِ تو ایم

بہ منزلی کہ رسیدی توقّفی باید
کہ ما رسیم بتو زانکہ ہمرہانِ تو ایم

مثالِ سالکِ وحسرتِ چو رفتہ ای تو صلاح
ترا سلیم بجوید کہ قدردانِ تو ایم

(بیادِ دوستِ عزیزم صلاح الدین احمد مرحوم)

تپ و گدازِ جہاں از دلِ تباہِ من ست
جمالِ حسنِ بتاں ایں ہم از نگاہِ من ست

بہشت از غمِ یک رنگینش چشم بود
ہر انچہ کرد زمیں را ارم گناہِ من ست

بہ یمنِ سرِ تو تاجدارِ ملکِ سخن
سفینہ ہائے غزل لشکر و سپاہِ من ست

خیالِ تابِ رخِ کیست در دلم امشب
کہ رشکِ ماہِ منور شبِ سیاہِ من ست

اگرچہ مہر و محبت دریں جہان چراست
غنیمت است کہ ایں جرم گاہ، گاہِ من ست

چرا ز زلفِ بتانِ حسیں کنارا کنم
کہ در خرابۂ دنیا ہمیں پناہِ من ست

چہ نسبت است بمن اتقا فروشاں را
کہ ذکرِ زہد بسی بدتر از گناہِ من ست

نہ کافرم نہ مسلماں نہ گبر نے ترسا
بیا بہ بزمِ محبت کہ قبلہ گاہِ من ست

چہ مدتی است کہ از کیف ماندہ ام محروم
سلیم بزمِ مسرت نظر براہِ من ست

☆☆☆

من کہ خود تقدیم او کردم دلِ دیوانہ را
انچناں مانم کہ گم کردم چراغِ خانہ را
اخگرِ سوزاں کہ مضمر در نہادِ آدم است
شمع را شعلہ شود آتش زند پروانہ را
اے کہ چوں شبنم خنک تاثیر چشمانِ تو است
سر تفنگی ہائے مشکیں ببر چہ خس خانہ را

☆☆☆

می گردم انچناں بہ خیابان و کوئے او
گویا کہ دارد این نہ درازی بجوئے او
خالِ طلائی اش کہ چو زنبورِ شہد بود
ما لب برو نہادہ نکیدیم روئے او
در اشتباہِ جنبشِ ابرو و چشمِ او
صد بار می رویم بہ اطرافِ سوئے او

☆☆☆

حذ نگہت آن چہ بینی
چرخ اولی نہ ہفتمینی
آنانکہ نشستہ در مکینی
گویند چرا، چناں، چنینی
ہیچ ہر دو جہان و من نہ بینم
سوی نگہ ہاۓ آن و اینی
ہر سمت خود یقین دارم
خود را نہ کشم بہ بی یقینی
آدم ہمہ آدمند و باشد
فرق نہ میانِ ترک و چینی
تو کور عقیدہ بودی باشی
ز انساں تو چرا جدا نشینی
باشد نہ اگر حریصِ ثروت
یک آدم مبتلا نہ بینی

حرص است که نیش مار گردد

باشد ز طبعت و نه کینی

یک جنت ارض آدمی زاد

یک جاست تو هر کجا نشینی

هر شعر سلیم در چکامه

هر خاتم شعر را نگینی

باشی تو مدام دم کشیده
لطفِ تو کدام کس چشیده
خطی ست منوری بدیده
آں ماه کجا قدم کشیده
دارد نہ توقع بریده؟
آن کس کہ بہ کوی تو دویده
از ما نشنید یک سخن ہم
حرفِ بدِ غیر را شنیده
ترکِ دو جہاں نمود ایں دل
شد بی طلب و شد آرمیده
جنبش بہ لبم ز آه آمد
رنگِ تو چرا چنیں بریده
یوسف شده کمترک کہ ما را
پیراہنِ جاں شده دریده

چوں ذرۂ ریگ ماندہ بودم

چراں شدم او چرا رمیدہ

دید است کہ سرو در بیاباں

کئے گل ز سموم ہا رمیدہ

خواہم کہ عروسِ مرگ یابم

لیکن نہ شوم کمر خمیدہ

اے گریہ خندہ دار کشتی

شبنم ز رخ گلی چکیدہ

اسم بہ زبانِ ہر کسی شد

شادیم کہ وقتِ ما رسیدہ

آہی نہ کشد سلیم داند

گز در نہ کسی نفس گزیدہ

☆☆☆

آن تند خوی شعله رخی کو کرم نداشت
آتش بجانِ ما زد و ترسِ عدم نداشت
ہر شعرِ ما چو آئینۂ حسنِ یار بود
با وصفِ آن کہ گفت زمانہ صنم نداشت
پیماں شکست از کسی اعتبارہا
من یار · یار مرا محترم نداشت

☆☆☆

دیوانہ وار سوختہ فرزانہ سوختیم
بر آتشِ غمِ تو سپندانہ سوختیم
نازیم زانکہ فکرِ خلائق ہمی کنم
بہر حرم نہ بہر صنم خانہ · ·
پروانہ جاں بہ شمع دید شمع صبح را
ما مثلِ آفتاب دواجانہ سوختیم
دل سوختہ بر حسود حسد سوختہ بسی
حالی چو از ولائے بشر سوختیم ما
از ہرچہ بود قصہ و افسانہ سوختیم
آتش زدیم ما بہ خیالِ قصور و کاخ
مردم نفور بود چہ کاشانہ سوختیم
شعلہ بجاں سلیم ز غم ہائے مردمیم
تنہا نہ سوختیم و چہ مردانہ سوختیم
☆☆☆

پے بہ پے می رسد از دور صدائے جرسی
خیز اے ہمتِ مردانہ کہ منزل برسی
اے کہ دل دادۂ غم ہائے فراواں شدہ ای
با خبر باش ازیں راہ بجائی نرسی

☆☆☆

ہرزہ گردیدنِ ما مثلِ نجوم است و صبا
نکہت و روشنیِ ماست اگر رازی ہست
ہمتِ خود، تو بہ جولانیِ پرواز بدہ
ورنہ دام است بہ ہر شہر د قفس سازی ہست

☆☆☆

زلفی بہ پیچ آمد و از چشمِ ما گذشت
ابری پدید آمد و از آسماں گذشت
گل ہائے زخمِ دل نہ طراوت نمی گرفت
یادت مثالِ سایۂ ابرِ رواں گذشت

☆☆☆

خیامِ نو

غیاث الدین ابوالفتح عمرو بن ابراہیم المتخلص بہ عمر خیام
کی منتخب رباعیات کا منظوم ترجمہ
بہ ترمیم و اضافہ

از

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

خیامِ نو (عمر خیام کی رباعیوں کا منظوم ترجمہ)

مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ عمر خیام کی رباعیات کا جو منظوم ترجمہ میں نے کیا ہے وہ ترجمہ سے زیادہ ترمیم و اضافہ ہے۔ بلکہ اگر کوئی رجعت پسند قاری یہ کہنا چاہے کہ بہت سی رباعیات کے ترجمے میں، میں نے اصل مضمون یا موضوع سے انحراف کیا ہے تو اس کی یہ بات بھی مبنی بر صداقت ہوگی۔ لیکن میں اس غلط فہمی کا ازالہ بہر صورت کرنا چاہتا ہوں کہ انحراف سہواً وقوع پذیر نہیں ہوئے بلکہ بالقصد و ارادہ ہیں۔ یہی سبب ہے کہ کہیں کہیں میرے ترجمے کا مفہوم عمر خیام کے نفسِ مضمون سے بالکل مختلف یا مخالف ہے۔ یہ انحراف جہاں جہاں اس قدر زیادہ ہو کہ ترجمے کی بجائے جوابِ رباعی محسوس ہو تو اسے فارسی میں میرے عدمِ مہارت یا عجزِ فہم پر محمول نہ کیا جائے بلکہ اسے شعوری کوشش اور مترجم کا فطری اظہارِ ذات سمجھا جائے جو ترجمے میں راہ پا گیا ہے۔

میں اس میں بھی کوئی ہرج نہیں سمجھتا کہ کوئی انحطاطی اور زوال خوردہ خیالات کا شیدائی میرے منظوم ترجمے کو سرے سے ترجمہ سمجھنے سے انکار کر دے اور کہہ دے کہ میرا منظوم ترجمہ میرا اپنا تخلیقی کام ہے یا کارنامہ ہے۔ مجھے اس امر کے اظہار میں قطعاً کوئی تامل نہیں کہ یہ عمر خیام جو میرے منظوم ترجمے میں قاری کو چشمِ تصور سے دکھائی دیتا ہے وہ عمر خیام نہیں جو نظام الملک طوسی اور حسن بن صباح کا ہم عصر تھا۔ جو دن کو فلکیات و افلاک کے مطالعہ و مشاہدہ میں غرق رہتا اور شام

کوشاہد وشراب اور رنگ ونغمہ کی دنیا میں گم ہو کر خد وخال اور زلف ورخسار کی پیائش پرکار انگشت سے کرتا۔

اگر بعض طنز نگاروں کا یہ کہنا حقیقت پر مبنی ہے کہ بہترین طنز آنسوؤں کے سرچشمے سے ابھرتا ہے تو یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ مسرت وسرخوشی کی تند وتیز لہریں غم کے سمندر ہی سے اٹھتی ہیں اور انسان کوشش سے غم کو خوشی میں بدل سکتا ہے۔ میں نے اپنی اسی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے عمر خیام کا یہ منظوم ترجمہ کیا ہے۔ اور یہ ترجمہ اگر میری زندگی ہی میں کتابی صورت میں قارئین کے ہاتھوں تک رسائی حاصل کر لے تو معجزہ سے کم نہ ہوگا کیونکہ جن حالات میں، میں نے یہ ترجمہ کیا ہے ان میں میرے لیے کوئی ادبی کام کرنا تو در کنار، زندہ رہنا ممکن نہیں۔ اور زندگی شاہد وشراب اور مطرب وساقی سے کوسوں دور ہے۔

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

عمر خیام

آمد سحری ندا ز میخانۂ ما
کای رندِ خراباتی دیوانۂ ما
برخیز کہ پر کنیم پیمانہ ز مے
زاں پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جب رات گئی تو وقت سحر، گونجی یہ صدا میخانے میں
کیا رند میں کوئی جان نہیں، کیا ہوش نہیں دیوانے میں
اٹھ جام کو بھر اور جھوم کے پی ہے سر پہ وہ وقتِ نازک بھی
جب موت کی مے چھلکے سے بھرے بے رحم قضا پیمانے میں

عمر خیام

گر مے نہ خوری طعنہ مزن مستاں را
گر دست دہد توبہ کنم یزداں را
تو فخر بدیں کنی کہ من مے نخورم
صد کارکنی کہ مے غلام است آں را

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

تقویٰ کے تفاخر رہنے دے اور زعم نہ بادہ پینے کا
اپنا بھی ارادہ رہتا ہے توبہ کے جہاں میں جینے کا
اے خونِ بشر کے متوالے، بے رحم غلام حرص و ہوس
یہ بادہ کشی تو رستہ ہے معصوم خوشی کے دفینے کا

عمر خیام

اے خواجہ یکی کام روا کن ما را
دم در کش و در کار خدا کن ما را
ما راست، رویم لیک تو کج بینی
روچارۂ دیدہ کن رہا کن ما را

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

اے خواجہ ہمارے حق میں ترا احساں ہو اگر اک کام کرے
سونے کے بتوں کی پوجا میں کیوں نام بشر بد نام کرے
انساں کے لہو سے رنگیں ہیں جو ہاتھ اگر آئیں نہ نظر
یا اپنا علاج آنکھوں کا کرے یا ضعفِ بصارت عام کرے

عمر خیام

بت گفت بہ بت پرست کای عابدِ ما
دانی کہ چہ روی گشتہ ای ساجدِ ما
بر ما بجمال خود تجلی کر دست
ان کس کہ زتست ناظر و شاہدِ ما

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

کہتا تھا زبانِ حال سے، یہ اک بت کا نظارا کیا دیکھا
اے اندھے پجاری کیا سمجھا اور جلوہ ہمارا کیا دیکھا
جو تیری نظر سے تکتا ہے، خود جلوۂ بت میں چھپتا ہے
وہ پیار ترا یہ روپ مرا، یہ حسنِ اشارہ کیا دیکھا

عمر خیام

با بط ی گفت ماہئی در تب و تاب
باشد کہ بجوی رفتہ باز آید آب
بط گفت کہ چوں من و تو گشتیم کباب
دنیا پس مرگ ما چہ دریا چہ سراب

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

اک بطخ سے اک ماہی نے کہا، کیا درد بھری بے تابی ہے
ندی سے جو پانی گزرا گیا، لوٹ آئے گا راہِ آبی سے
بط نے یہ کہا جب ہم ندی ہیں اور جہاں سے گزر کر بھی چکیں
کیا فرق سراب و حقیقت میں، کیا کام خرامِ شتابی سے

عمر خیام

ما ئیم و مے و مطرب و این کنجِ خراب
جان و دل و جام و جامہ در رہنِ شراب
فارغ ز امید رحمت، وبیم ز عذاب
آزاد ز خاک و باد و ز آتش و آب

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

محبوب و شراب و مطرب سے، ویرانۂ ہستی گلشن ہے
اس رنگِ طرب سے تہ جامہ، رنگین اسی سے تن من ہے
ہر لحظہ عیش غنیمت ہے، اک وہم بہشت و دوزخ ہے
آزاد ہے قیدِ توہم سے، میخانہ جو اپنا گلشن ہے

عمر خیام

ایں کہنہ رباط راکہ عالم نام است
و آرامگہِ ابلق صبح و شام است
بزمیست کہ واماندۂ صد جمشید است
قصری است کہ تکیہ گاہِ صد بہرام است

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

یہ کہنہ سرا، ہاں جس کے لیے عالم کا مثالی نام بھی ہے
جس طرح تغیر خانہ میں یہ ابلق صبح و شام بھی ہے
اس قصر کہن میں جتنے بھی زور آور و جابر غاصب تھے
تاریخ کے رخ پہ دھبہ ہے ان میں جو کسی کا نام بھی ہے

عمر خیام

صحرا رخ خود از ابر نو روز بشست
ایں دہر شکستہ دل بہ نوگشت درست
باسبز خطی بسبزہ زاری مے خور
بر یادِ کسی کہ سبزہ از خاکش رُست

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

برسی ہیں گھٹائیں ساون کی، گلشن میں عجب ہریالی ہے
پھولوں پہ سجے ہیں موتی سے، موتی کی لڑی ہر ڈالی ہے
آ بزم سجائیں سبزے پر اور ہاتھ رکھیں پیمانے پے
چھلکائیں ہم ان کے نام پہ بھی، وہ جن کی جگہ اب خالی ہے

عمر خیام

خیام کہ خیمہ ہای حکمت می دوخت
در کورۂ غم فتاد و ناگاہ بسوخت
مقراض اجل طناب عمرش چو برید
دلالِ قضا بہ رائگانش بفروخت

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

حکمت کے جو خیمے سیتا تھا، سنتے ہیں کہ وہ خیام گیا
بھٹی میں اچانک غم کی گرا، جل بجھ کے سوئے انجام گیا
مقراضِ اجل کی دھاروں نے کاٹی ہے طنابِ عمر اس کی
دلال امیدِ فانی کا سودائے زیاں بے دام گیا

عمر خیام

دردہ پسر آں مے کہ جہاں را تاب است
زاں مے کہ گلِ نشاط را مہتاب است
بشتاب کہ آتش جوانی آب است
دریاب کہ بیداریٔ دولت خواب است

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

لا مُغ بچہ دارو جس سے یہاں، تابندہ نگارِ ہستی ہے
مشرب کے گلوں پر جس سے پھبن مہتابِ بہارِ ہستی ہے
یہ آگ طربناک آتش ہے، جذباتِ جواں کی تابش ہے
دے جلد یہ حسن قسمت ہے، اس سے ہی خمارِ مستی ہے

عمر خیام

یزداں چو گلِ وجود ما را آراست
دانست ز فعلِ ماچہ برخواہد خاست
بے حکمش نیست ہر گناہی کہ مراست
پس سوختن قیامت از بہر چہ خواست

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جو قادر مطلق جوہر ہے، ہر گل کا، بہار ہستی کا
دانا تھا امور ظہوری کا، ہر فعل بلندی و پستی کا
ہے اس کی ہی حکمت سامانی ہر فعل و گناہِ انسانی
پچھتاوے کے شعلے کیوں بھڑکیں، کیوں چہرہ جلائیں مستی کا

عمر خیام

ایں کوزہ چومن عاشق زاری بود است
در بند سرزلفِ نگاری بود است
ایں دستہ کہ در گردنِ او می بینی
دستی است کہ در گردن یاری بود است

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

یہ کوزۂ مئے بھی میری طرح تھا عاشق زار دمستانہ
دو دن کی حیاتِ دنیا میں وارفتہ زلف و پیمانہ
دستہ ہے جو اس کی گردن میں اک قوسِ قزح سا ساون میں
وہ ہاتھ ہے جو ہوتا ہے کبھی زنجیر گلوئے جانانہ

عمر خیام

با بادہ نشیں کہ ملک محمود این است
وز چنگ شنو کہ لحنِ داؤد این است
از نامدہ و رفتہ دگر یاد مکن
حالے خوش باش زانکہ مقصود این است

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہاں محفل ناؤ نوش رہے پائندہ یہی جاگیر تو ہے
اک قصہ ہے لحنِ داؤدی، یہ ساز طرب تاثیر تو ہے
پی، آئے گئے کی فکر نہ کر اور گزرے دنوں کا ذکر نہ کر
مستقبل و ماضی جس میں نہاں ہے حال کی اک تنویر تو ہے

عمر خیام

در فصل بہار اگر بتِ حور سرشت
یک ساغر ی دہد مرا بر لب کشت
گرچہ بر ہرکس این سخن باشد زشت
سگ بہ زمن اردگر برم نامِ بہشت

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

اس سحر سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں بر روئے زمیں بر عرشِ بریں
اک گوشۂ باغ اک تجھ سا حسیں اک پیالہ مے اک نانِ جویں
اک سایۂ سرو، اک جوئے رواں، ہیں حاصلِ بخت و عمرِ جہاں
جنت ہے اگر کچھ اس کے سوا منظور نہیں، منظور نہیں

عمر خیام

در ہر دشتی کہ لالہ زاری بود است
آں لالہ ز خون شہر یاری بود است
ہر برگ بنفشہ کز زمیں می روید
خالیست کہ بر رخ نگاری بود است

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جو دشت بھی اب آتا ہے نظر پھولوں کا ٹھکانا ہوتا تھا
جلووں کی پھواریں پڑتی تھیں موسم بھی سہانا ہوتا تھا
ایسے ہی جہاں اب گلشن ہے ہر ذرہ کسی کا تن من ہے
ہر برگِ بنفشہ و تلِ ہے دل جس کا نشانہ ہوتا ہے

عمر خیام

گویند کساں بہشت باحور خوش است
من می گویم کہ آب انگور خوش است
این نقد بگیرو دست از آں نسیہ بشوی
کاواز دُہل شنیدن از دور خوش است

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

کہتے ہیں کہ وصلِ حور ملے یا عشرتِ باغِ رضوانی
کہتا ہوں کہ مے سے کمتر ہے تخیل کی ساری جولانی
جنت تو خیالی وعدہ ہے، یاں ہاتھ میں جامِ بادہ ہے
وہ دور کا ڈھول تخیل کا، یہ ٹھوس حقیقتِ انسانی

عمر خیام

از گردش چرخ ہیچ مفہوم نیست
جز رنج زمانہ ہیچ موہوم نیست
ہر چند بکار خویش در می نگرم
عمری بگوشت و ہیچ معلوم نیست

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

اس چرخِ کہن کی گردش کا مفہوم ہے کیا معلوم نہیں
اور طرفہ تماشا یہ کہ یہاں جو درد بھی ہے موہوم نہیں
اک عمر ہے نذرِ بے خبری، کیا ہم نے کیا، کیا کرنا ہے
لا، بادہ کہ عمرِ رفتہ پر، ہم کہہ بھی سکیں، مغموم نہیں

عمر خیام

گر از پے شہوت و ہوا خواہی رفت
از من خبری، کہ بی نوا خواہی رفت
بنگر چہ کسی و از کجا آمدہ ای
می دان کہ چہ می کنی کجا خواہی رفت

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

اغراض و ہوس کی آگ میں کیوں، جل جل کے عدم کی سمت چلیں
کیوں بہرِ خبر بت خانوں کو، یا دیر و حرم کی سمت چلیں
ہاں دیکھ کہ بزمِ دنیا میں، کیا تیرے وجود کی غایت ہے
جو صرف طلسمِ خیالی ہے کیوں ایسے ارم کی سمت چلیں

عمر خیام

دارندہ چوں ترکیب طبائع آراست
از بہر چہ افگندش اندر کم و کاست
گر نیک آمد شکستن از بہر چہ بود؟
ور نیک نہ آمد این صور عیب کراست؟

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ترکیب عناصر طبع بشر، فطرت کی یہ ساری محفل بھی
صانع کی خود اپنی صنعت ہے، پھر کیوں ہو زوال کامل بھی
کامل ہیں اگر نقاش کے نقش، ان میں ہو شکست و ریخت تو کیوں
ہے نقص اگر کچھ رنگوں میں خود اس کی خطا ہے شامل بھی

عمر خیام

اے آمدہ از عالم روحانی تفت
حیران شدہ در پنج و چہار و شش و ہفت
مے خور کہ ندانی از کجا آمدہ ای
خوش باش ندانی بکجا خواہی رفت

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

روحوں کے جہاں سے آمد کا دعویٰ ہے تو حیرت کیوں ہے تجھے
خوبوں کے لیے بیتاب ہے کیوں انسان کی چاہت کیوں ہے تجھے
یہ تیرے حواس اطراف وجہت، افلاک وعناصر تیرے ہیں
پی بادہ، خوشی کے گیت سنا فطرت سے کدورت کیوں ہے تجھے

عمر خیام

اکنوں کہ جہاں را بخوشی دسترسی ست
ہر زندہ دلی را سوی صحرا ہوسی ست
بر ہر شاخ طلوع موسیٰ قبسی ست
در ہر نفسی خروشِ عیسیٰ نفسی ست

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جب باغِ جہاں میں عشرت کی گھنگھور گھٹائیں چھا جائیں
پھولوں کی طرح سے جام بکف، مخمور خوشی میں لہرائیں
ہر نغمہ صدائے غیبی ہے، موسیٰ نے سنی جو صحرا میں
ہر سانس دمِ عیسیٰ سے سوا، دل جس سے حیاتِ نو پائیں

عمر خیام

فصل گل و طرف جویبار و لب کشت
با یک دوسہ تازہ لعبتی حور سرشت
پیش آر قدح کہ بادہ نوشانِ صبوح
آسودہ ز مسجد اند وفارغ زکنشت

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

یہ فصلِ بہار و تختۂ گل، ندی میں یہ موجیں پانی کی
یہ زندہ و بزم و خوب و حسیں گڑیائیں جہان فانی کی
کیوں مست نہ ہوں اس منظر سے اور صبح کی مے کے ساغر سے
کیوں شغلِ فضول دیر وحرم ، کیوں بحثیں کھینچا تانی کی

عمر خیام

ساقی گل و سبزہ بس طربناک شد است
دریاب کہ ہفتۂ دگر خاک شد است
مے نوش و گل بچین کہ چوں در نگری
گل خاک شد است وسبزہ خاشاک است

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

پھر سبزہ و گل پر لہر آئی، اور دور ہر اک غمناکی ہے
دے بادۂ عیش شتابی سے ساقی کہ یہ دور افلاکی ہے
کچھ جام چلے کچھ پھول چنیں، دیکھو گے وگرنہ کچھ دن میں
جو پھول تھا نذرِ خاک ہوا، جو سبزہ ہے فرشِ خاکی ہے

عمر خیام

بس خون کساں کہ چرخ بیباک بریخت
بس گل کہ برآمد زگِل وپاک بریخت
بر حسنِ جوانیِ اے پسر غزہ مشو
بس غنچہ ناشگفتہ برخاک بریخت

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

کتنوں کے حسابِ ہستی کو، بے رحم فلک نے پاک کیا
کیا پھول اگائے مٹی سے، اور ان کو دوبارہ خاک کیا
مغرور نہ ہو اے جانِ جہاں، نوخیز جمالِ رنگیں پر
کلیوں کو بھی چرخِ گردوں نے، تاراج یہاں بیباک کیا

عمر خیام

مے نوش کہ عمرِ جاودانی این است
خود خاصیت از دورِ جوانی این است
ہنگامِ گل و مل است و یاران سرمست
خوش باش دمی کہ زندگانی این است

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

پی بادہ کہ عمرِ فانی میں، جرعاتِ بقا ہیں ساغر میں
خود لطفِ جوانی پنہاں ہے، ہر ساغرِ عشرت پرور میں
جب بادہ کشی کا موسم ہو، یاروں کو خمارِ پیہم ہو
تب رنگ حیاتِ دائم کا، آتا ہے نظر ہر منظر میں

عمر خیام

آباد خرابات زمے خوردنِ ماست
خونِ دو ہزار توبہ در گردنِ ماست
گر من نکنم گناہ رحمت چہ کند
آرائشِ رحمت از گناہ کردنِ ماست

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ساقی یہ جہانِ مے خانہ، آباد ہوا ہے جس دم سے
ہے دورِ سبو و پیمانہ، توبہ شکنی کے عالم سے
اے جانِ جہاں وہ جام اٹھا اور خودنگری سے ہوش میں آ
جب ہم ہی نہ ہوں گے کیا ہوگا آرائشِ زلفِ برہم سے

عمر خیام

ساقی دل من کہ شادی از غم نشناخت
جز جامِ مے از نعیمِ عالم نشناخت
مے دہ کہ دمِ صبوح جان بخشِ دم است
کس غیر مسیح قدرِ این دم نشناخت

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جو غم کو اڑانے والی ہے حاصل ہے تو ساقی کیا غم ہے
جو مے سے زیادہ نشہ دے، کیا ایسی متاعِ عالم ہے
ہے وقتِ صبوحی جام چلے، ہاں مردہ دلوں میں جان پڑے
اس آبِ حیات آور کے جلو، عیسیٰ نفسوں کا سرخم ہے

عمر خیام

ساقی قدحے کہ کارِ عالم نفسے است
گر شادی از و یک نفس آن نیز بسے است
خوش باش ز ہر چہ پیش آید ز جہاں
ہرگز نشود چناں کہ دل خواہِ کسے است

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

یہ سانس کی ڈوری جب تک ہے، بے کار جہاں بھی اے ساقی
جو لمحے خوشی کے مل جائیں، ہیں حاصلِ جاں بھی اے ساقی
ہیں خار کبھی تو پھول کبھی، دامانِ بہارِ ہستی میں
ہے یہ بھی بہت جو یوں ہی کٹے، عمرِ گزراں بھی اے ساقی

عمر خیام

جامی و مئی و ساقئی بر لب کشت
ایں جملہ مرا نقد ترا نسیہ بہشت
مشنو سخنِ بہشت و دوزخ از کس
کہ رفت بدوزخ و کہ آمد ز بہشت

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ندی کے کنارے سبزے پر، ساقی یہ سبو و پیمانہ
یہ لالہ و گل، یہ ابر و ہوا، یہ تیری نگاہِ مستانہ
فردوس و جہنم مفروضے، تفصیل بھی جن کی لاحاصل
جب دل کی مرادیں پوری ہوں، کیوں یونہی سنائیں افسانہ

عمر خیام

چون آب بجویار و چون باد بہ دشت
روزِ دگر از عمرِ من و تو بگذشت
تا من باشم غمِ دو روزہ نخورم
روزی کہ نیا مدست و روزی کہ گذشت

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

کیا جلد وہ کل کا دن گزرا، کیا بات ہے اس کی روانی کی
گویا کہ ہوا کا جھونکا تھا، یا موج ندی میں پانی کی
کیوں رنج ہو اس کے جانے کا، جو بیت گیا سو بیت گیا
یہ حال کا لمحہ غنیمت ہے، یہ جان ہے عشق و جوانی کی

عمر خیام

ما کافرِ عشقیم و مسلماں دگر است
ما مورِ ضعیفیم و سلیماں دگر است
از ما رخ زرد و جگر پارہ طلب
بازارچۂ لقب فروشاں دگر است

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہاں عشق ہمارا مذہب ہے ہم مردِ مسلماں کیا ہوں گے
کمزور سہی جمہور ہیں ہم، مائل بہ سلیماں کیا ہوں گے
انساں کے نہیں ہم بیوپاری، سوداگرِ ننگ و نام نہیں
بازارِ نسب میں جنسِ لقب بیچیں گے تو انساں کیا ہوں گے

عمر خیام

خاری کہ بہ زیر پای ہر حیوانی است
زلفِ صنمی و ابروی جانانی است
ہر خشت کہ بر کنگرۂ ایوانی است
انگشتِ وزیری و سرِ سلطانی است

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

چبھتے ہیں جو کانٹے تلووں میں، تھے خال کبھی رخساروں کے
گیسو تھے حسیں نوخیزوں کے، ابرو تھے حسیں مہ پاروں کے
ہاں یوں ہی جو خشتِ پختہ ہے، قہاروں کی خاکِ رفتہ ہے
اب عہدِ نوی کے جام چلیں اور نام نئے معماروں کے

عمر خیام

من بندۂ عاصیم رضای تو کجاست
تاریک دلم نور صفای تو کجا ست
ما را تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی
ایں مزد بود، لطف و عطای تو کجا ست

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

یہ جرم وخطا کا شور ہے کیا، کیا ہے یہ رضا کا افسانہ
تاریک اگر ہے بزمِ وفا، جلووں کا کہاں ہے پیمانہ
فردوس اگر طاعت سے ملے، بخشش تو نہیں مزدوری ہے
محنت کا صلہ ملنا تھا اگر، پھر کیا ہے عطائے جانانہ

عمر خیام

ای و ای بران دل کہ درو سوزی نیست
سودا زدۂ مہر دل افروزی نیست
روزی کہ تو بی بادہ بسر خواہی برد
ضائع تر از آں روز ترا روزی نیست

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جو مہر و وفا سے عاری ہے، بیکار ہے، خشک اک ڈالی ہے
یا مے کے بغیر اک شیشہ ہے، یا جام ہے اک جو خالی ہے
بے بادہ جو دن بھی گزرے گا، سمجھو کہ وہ دن ہے دادطلب
جو عمر کے در پر دستک ہے، جو کیف کا اب بھی سوالی ہے

عمر خیام

رفتم بہ خرابات بہ ایمانِ درست
زنارِ مغاں را بہ میاں بستم چست
شاگردِ خرابات ز بدنامی من
رُفتم بدر افگند و خرابات بشست

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہاں عشق و وفائے انسانی، ہم بادہ کشوں کا ایماں ہے
زنارِ مغاں ہے اپنا نشاں، ہاتھوں میں بتوں کا داماں ہے
کیوں کوئی نکالا جائے یہاں، کیوں فرش دھلایا جائے یہاں
میخانہ ہے یہ مسجد تو نہیں، انسان یہاں پر انساں ہے

عمر خیام

درچشمِ محققاں چہ زیبا و چہ زشت
منزل گہِ عاشقاں چہ دوزخ چہ بہشت
پوشیدنِ بے دلاں چہ اطلس چہ پلاس
زیرِ سرِ عاشقاں چہ بالیں و چہ خشت

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ماہیتِ ہستی جان چکے، دنیا کی حقیقت دیکھ چکے
دوزخ بھی یہی جنت بھی یہی، سب رنگِ صداقت دیکھ چکے
ہاں عشق ہمارا مذہب ہے، مسند طلبی سے کام نہیں
پتھر کا بنا کر بالیں بھی، معراجِ محبت دیکھ چکے

عمر خیام

مہتاب بہ نور دامنِ شب بشگافت
مے خور کہ دمے خوش تر ازاں نتواں یافت
خوش باش ومیندیش کہ مہتاب بسے
اندر سرِ خاک یک بیک خواہد یافت

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

کرنوں کی چلی ہیں سنگینیں، وہ دامنِ شب صد پارہ ہے
ظلمات پہ ماہِ کامل نے، شب خون غضب کا مارا ہے
اٹھ جام کو بھر اور گیت سنا، ساقی کہ سحر کے آنے پر
جب خوب اجالا پھیلے گا، دیکھو گے زمانہ ہمارا ہے

عمر خیام

اے دل چو زمانہ می کند غمناکت
تاگہ برود ز تن روانِ پاکت
بر سبزہ نشین و خوش بزی روزے چند
زاں پیش کہ سبزہ بردمد از خاکت

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

قبل اس کے کہ دردِ محرومی، کچھ اور تجھے غمناک کرے
یا وار اجل کا اچانک ہو اور قضیہ ہستی پاک کرے
کر سبزہ و گل کی سیر ذرا، سبزہ ہی بالآخر ہوتا ہے
وہ بھی جو گھٹا گھِر آئے کبھی، اور خاک تری نمناک کرے

عمر خیام

ابر آمد و باز برسرِ سبزہ گریست
بے بادۂ ارغوان نمی باید زیست
امروز کہ این سبزہ تماشاگہ ماست
تا سبزہ خاکِ ما تماشا کہ کیست

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

وہ دیکھ گھٹائیں گھر گھر کے، پھر صحنِ چمن پر برسی ہیں
دے بادہ کہ نظریں مدت تک، اس منظر خوش کو ترسی ہیں
بل اس کے کہ مٹی ہو تن من، فرصت ہے ابھی کر سیرِ چمن
پھولوں کی وہ شاخیں دیکھ ذرا، ہر سمت جو سنگ گہری ہیں

عمر خیام

امروز کہ موسمِ جوانیِ من است
ے نوشم زاں کہ کامرانی من است
عیبش مکنید اگرچہ تلخ است خوش است
تلخ است ازانکہ زندگانیِ من است

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہستی کے چمن میں پھولوں کا موسم ہے شباب گزراں ہے
ہے جوشِ جوانی رندوں پر اور بادہ کشی کا ساماں ہے
ہے تلخ اگر یہ رنگینی، اپنی ہی حیات کی تلخی ہے
یہ ذائقہ جزوِ ہستی ہے، یہ ذائقہ جانِ انساں ہے

عمر خیام

در مجلس دہر ساز مستی پست است
نے چنگ و نائی نہ دلم ورد است
رنداں ہمہ ترکِ مے پرستی کردند
جز محتسبِ شہر کہ دائم مست است

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

رندوں نے جو ترک جام کیا، ترک اپنی متاع مستی کی
جی چھوڑ دیا نغمے نہ رہے، رونق نہ رہی کچھ ہستی کی
رہتا ہے وہی اک نشے میں، کرتا تھا جو منع ساغر سے
اعلیٰ ہے وہی اب اس کے لیے، جو بات تھی پہلے پستی کی

عمر خیام

نیکی و بدی کہ در نہادِ بشر است
شادی و غمی کہ در قضا وقدر است
با چرخ مکن حوالہ کاندر رہِ عقل
چرخ از تو ہزار بار بیچارہ تر است

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

نیکی و بدی ہستی کے دو رخ، آئینۂ دل کے اندر ہیں
آئینِ قضا و قدر یہاں کب سعیِ بشر سے باہر ہیں
یہ نکتۂ عقل وصداقت ہے انسان کے بس میں فطرت ہے
تقدیر وقضا، تسلیم ورضا، عیاروں کے اپنے چکر ہیں

عمر خیام

ہر سبزہ کہ بر کنار جوئی رستہ است
گوئی زلب فرشتہ خوئی رستہ است
پا برسر ہر سبزہ بخواری نہ نہی
کاں سبزہ زخاک لالہ روئی رستہ است

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ندی کے کنارے سبزہ ہے یا بھیگی مسوں کا رنگ ہے یہ
معصوم جو مثلِ ملائک تھے، اب ان کی قبائے تنگ ہے یہ
جو پھول سے چہرے والے تھے، انداز بھی جن کے نرالے تھے
اب ان کے ظہورِ خاکی کا، کیا خواب نرالا ڈھنگ ہے یہ

عمر خیام

سیم گرچہ نہ مایۂ خرد مندان است
بی سیماں را باغ جہاں زنداں است
از دستِ تہی بنفشہ سر بر زانو ست
و زکیسۂ زر دہانِ گل خنداں است

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جب کھیل ہو سونے چاندی کا، کیا بول خرد کا بالا ہو
زنداں ہے جہاں مفلس کے لیے، چاہے وہ ہنر میں یکتا ہو
خالی ہے بنفشہ زر سے تو، سرزانو پہ دھرے ہے گلشن میں
جس گل کو ہے حاصل کیسۂ زر، کیوں کر نہ خوشی سے دمکتا ہو

عمر خیام

گردوں ز زمین ہیچ گلی بر نارد
کس نشکند و باز بہ گل نسپارد
گر ابر چو آب، خاک را بردارد
تا حشر ہمہ خونِ عزیزان بارد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

مٹی کی تہوں سے کر کے نمو جو پھول چمن میں لہرایا
ظالم کے بڑھے ہاتھ اس کی طرف اور خاک میں آخر لوٹ آیا
بادل میں اگر وہ خون ڈھلے جو خاک میں ملتا رہتا ہے
پھر دیکھو کہ ابرِ گلشن نے سیلاب لہو کا برسایا

عمر خیام

ایں قافلۂ عمر جب می گذرد
دریاب دمے کہ باطرب می گذرد
ساقی غم فردای حریفاں چہ خوری
پیش آر پیالہ را کہ شب می گذرد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

یہ شام وسحر کے قافلے بھی آتے ہیں عجب ہی ڈھب سے یہاں
راکب ہیں اگر لمحات طرب کھینچ اپنی طرف مرکب سے یہاں
مے نوشوں کو کل کا دھڑکا کیوں، ساقی تجھے غم کا کھٹکا کیوں
بے جام نہ گزرے رات کہیں، پیالہ تو لگادے لب سے یہاں

عمر خیام

زان پیش کہ غمہات شبخون آرند
فرمای کہ تا بادۂ گلگون آرند
تو زرنۂ اے غافلِ نادان کہ ترا
در خاک نہند و باز بیرون .آرند

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ایسا نہ ہو غم کی یورش ہو، شب خون حوادث آن پڑے
کہہ دو کہ گلابی آ جائے، چھلکائیں تو کام آسان پڑے
اک بار اگر مٹی میں ملا، مٹی میں پڑا رہ جائے گا
پھر ساتھ کہاں ساتھی بھی کہاں، ممکن نہیں تجھ میں جان پڑے

عمر خیام

یاران موافق ہمہ از دست شدند
در پای اجل یکان یکان پست شدند
خوردیم ز یک شراب در مجلس عمر
دورے دوسہ پیشتر زما مست شدند

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

یاروں کی وہ محفل خواب ہوئی وہ رونق صبح و شام گئے
ہاتھوں سے اجل کے پست ہوئے وہ جلوہ وہ ایام گئے
ہاں بحر وجود کے ساحل پر دو روزہ شراب عمر بھی پی
ہاں ہم سے دو اک دور آگے ہی پی کر وہ مئے انجام گئے

عمر خیام

امشب مے جام یک منی خواہم کرد
خود را بہ دو جام مے غنی خواہم کرد
اول سہ طلاق عقل و دیں خواہم گفت
پس دختر رز را بہ زنی خواہم کرد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہاں ہاں میں پیوں گا۔ پے در پے کنٹر سے شرابِ انگوری
دو جام چڑھا کر کرلوں گا دور اپنا غمِ بے مقدوری
ہاں دین و عقل کی بڑھیا کو دے دوں گا طلاق بائن بھی
پھر دختر رز سے شادی کی مضبوط کروں گا منظوری

عمر خیام

مے خور کہ ز دل کثرت و قلت ببرد
و اندیشۂ ہفتاد و دو ملت ببرد
پرہیز مکن ز کیمیائی کہ ازو
یک جرعہ خوری ہزار علت ببرد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

پی بادہ کہ دل کے گوشوں میں اندیشۂ بیش و کم نہ رہے
ہفتاد و دو ملت کے جھگڑے اور تفرقہ عالم نہ رہے
پرہیز نہ کر اے جانِ جہاں مے ہے عجب اکسیر یہاں
اک جرعہ جو پی لے اوروں سے، برہم ہو اگر برہم نہ رہے

عمر خیام

خورشید کمندِ صبح بر بام افگند
کیخسرو روز بادہ در جام افگند
مے خور کہ منادیٔ سحر گہ خیزاں
آوازۂ اشربو در ایام افگند

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

کھول آنکھ نظر دوڑا تو ذرا، وہ شب کے طلسمی رنگ گئے
وہ ساغر شب کے ریزے ہیں، وہ بادۂ عود و چنگ گئے
مشرق میں نگار تاباں ہے کرنوں کا امنڈتا طوفاں ہے
ظلمت کے فسوں نے ڈھالے تھے جو چہرے شوخ و شنگ گئے

عمر خیام

گویند ز آن کسان کہ با پرہیزند
زان سان کہ بمیرند چناں بر خیزند
ما بادے و معشوق از آنیم مدام
تا بہ کہ بحشر مان چناں انگیزند

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

کہتے ہیں جو اہل تقویٰ ہیں تقویٰ میں اٹھائے جائیں گے
جس حال میں وہ دنیا سے گئے، ایسے ہی دکھائے جائیں گے
ہاں جلوہ گروں کی محفل میں عمر اپنی کٹی با ساغر ہے
کیا خوب عدم سے محشر میں، ایسے ہی جگائے جائیں گے

عمر خیام

یاراں چو باتفاق معیاد کنید
خود را بجمالِ ہم دگر شاد کنید
ساقی چو مئے مغانہ در کف گیرد
بیچارہ فلاں را بدعا یاد کنید

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جب جام و سبو کا دور چلے، مل بیٹھیں پرانے ساتھی بھی
پیالوں سے پیالے ٹکرائیں گردش میں ہو چشم ساقی بھی
دیدار سے دل کا جام بھریں اور بچھڑے ہوؤں کو یاد کریں
اس کام و دہن کی لذت میں لازم ہے کہ ہو تلخابی بھی

عمر خیام

در دہر کسی بہ گلعذاری نرسید
تا بر دلش از زمانہ خاری نرسید
در شانہ نگر کہ تا بصد شاخ نشد
دستش بہ سر زلف نگاری نرسید

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جو نشترِ غم سے بچ کے رہا، کب سادہ رخوں تک پہنچا ہے
جو ہاتھ بچا ہو کانٹوں سے، کب نرم گلوں تک پہنچا ہے
شانہ کی طرح دل چھلنی ہو، تب زلفِ بتاں تک پہنچے گا
زک جس کو نہ پہنچی آج تلک، کب جلوہ گروں تک پہنچا ہے

عمر خیام

کس را پسِ پردۂ قضا راہ نشد
و ز سرِ خدا ہیچ کس آگاہ نشد
ہر کس ز سرِ قیاس چیزی گفتند
معلوم نگشت و قصہ کوتاہ نشد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

تقدیر و قضا اک پرچھائیں جو عقل و خرد پر پردا ہے
خود ذاتِ خدا اک راز یہاں، اس راز کو کس نے سمجھا ہے
جو بزمِ جہاں سے باہر ہے سب وہم و گماں کا منظر ہے
وہ قصہ جسے سمجھا نہ کوئی لیکن ہر اک کہتا ہے

عمر خیام

یک جام ہزار مردِ بادین ارزد
یک جرعۂ مے مملکتِ چین ارزد
در روی زمین چیست زیادہ خوش تر
تلخی کہ ہزار جانِ شیرین ارزد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

اک بادہ کش مستانہ یہاں دیں داروں کی صف پر بھاری ہے
ایک جرعۂ مے وہ لعل ہے جو، سنگ و خزف پر بھاری ہے
میخانہ و جام و مینا سے کیا روئے زمیں پر بہتر ہے
مے تلخ سہی، شیرینیٔ جاں، خود جاں کے شرف پر بھاری ہے

عمر خیام

جانم بہ فدائی آنکہ او اہل بود
سر در قدمش اگر نہم سہل بود
خواہی کہ بدانی بہ یقین دوزخ زا
دوزخ بہ جہاں صحبتِ نا اہل بود

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جو قابل عشق و محبت ہے اس جانِ جہاں پر مرتے ہیں
اس سرو رواں کے شیدا ہیں، اس آفتِ جاں پر مرتے ہیں
جنت ہے یہی اور حور یہی، اس فصلِ بہار ہستی میں
دوزخ ہے تو ان کی محفل ہے، جو وہم و گماں پر مرتے ہیں

عمر خیام

خواہی کہ ترا رتبت اسرار رسد
مپسند کہ کس را ز تو آزار رسد
از مرگ میندیش و غمِ رزق مخور
کیں ہر دو بوقتِ خویش ناچار رسد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہستی کا جو رازِ سربستہ، کھولو گے یہ نکتہ پاؤ گے
جو ظلم کرو گے آخر میں اس ظلم کی زد میں آؤ گے
اندیشۂ آب و دانا کیوں اور موت سے گھبرا جانا کیوں
انجام بالآخر ہوگا حسیں جو خوب عمل کر جاؤ گے

عمر خیام

گویند کہ مرد را ہنر می باید
یا نسبتِ عالی پدر می باید
امروز چناں شد ست در نوبتِ ما
کین ہا ہمہ ہیچ ہست زر می باید

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

کہتے ہیں ہنر سے زیبائش، مردانِ جہاں کی ہوتی ہے
یا قدر نسب کی بلندی سے ہر پیر و جواں کی ہوتی ہے
لیکن یہ جہانِ سرمایہ، کرتا ہے پرستش دولت کی
کچھ پاس نہ ہو تو ناقدری، عالمِ صلتاں کی ہوتی ہے

عمر خیام

وقتی کہ طلوع صبح ازرق باشد
باید بہ کفت جامِ مرّوق باشد
گویند کہ حق تلخ بود در ہمہ حال
باید بہ ہمہ حال کہ مے حق باشد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جب نیل کے بحر مدوّر پر انوارِ سحر کا دامن ہو
لازم ہے طلوع ساغر سے، کرنوں میں ابھرتا جو بن ہو
جس طرح کہ سچ ہر حالت میں، شیرینی و تلخی رکھتا ہے
مے خواری کا حق بھی پورا ہو، اور حق کا یہ رخ بھی روشن ہو

عمر خیام

گر بادہ بہ کوہ برزنی رقص کند
ناقص بود آنکہ بادہ را نقص کند
از بادہ مرا توبہ چہ می فرمائی
روحیست کہ او تربیت شخص کند

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

کہسار بھی مے پی سکتے اگر اور جام چڑھاتے یاروں میں
تو عالمِ رقصِ مستی میں کچھ نقص نہ آتا پیاروں میں
بادہ سے فقط پاتا ہے جلا جو جوہرِ خوب و بد ہو چھپا
توبہ کے لیے تلقین نہ کر ان کو جو نہیں عیاروں میں

عمر خیام

قومی زگزاف در غرور افتادند
قومی زپئے حور و قصور افتادند
معلوم شود چو پردہ ہا بردارند
کز کوئ تو دور دور افتادند

اڈاکٹر سلیم واحد سلیم

اک قوم ہے وقفِ لاف زنی، انداز غرور آلودہ ہے
اک قوم خیالِ حور میں ہے، ذہن اس کا قصور آلودہ ہے
جلووں کی حقیقت کھول ذرا، چہرے سے نقاب الٹا کے بتا
دیدار کا دعویٰ یاروں کا، کس درجہ فتور آلودہ ہے

عمر خیام

از مے طرب و نشاط و مردی خیزد
در جمع کتب خشکی و سردی خیزد
رو بادہ بخور سرخرو خواہی ماند
کز خزاں سبزہ شکل زردی خیزد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

مردانہ صفت جینے کے لیے بادہ میں پیامِ عشرت ہے
ہاں سیرِ کتب کا شیدا تو مٹی کی طرح کا مورت ہے
مے سرخیِ رو کی ضامن ہے رنگین اسی سے ہر دن ہے
ساقی نہ ہوے تو ہر ذرہ اک برگِ خزاں کی صورت ہے

عمر خیام

بیماری و تپ در استخوانم دارد
ناخوردن مے قصد بجانم دارد
وین طرفہ نگر کہ ہر چہ در بیماری
جز بادہ خورم ہرچہ زیانم دارد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

رگ رگ میں تپش ہے شعلوں کی، ہر ریشہ بدن کا جلتا ہے
اور مے نہ پیوں تو ہر ذرہ، ہستی کے چمن کا جلتا ہے
ہے چیز عجب کہ بیماری، ہے طرفہ تماشا مے خواری
بچ جائے جو تن کا سرو یہاں، جو باغ ہے من کا جلتا ہے

عمر خیام

آورد بہ اضطرابم اول بہ وجود
جز حیرتم از حیات چیزی نفزود
رفتیم بہ اکراہ و ندانیم چہ بود
زیں آمدن وبودن و رفتن مقصود

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

بن بن کے مجسم بے تابی، جو بزمِ وجود میں آئے ہیں
ہاں روزِ ازل سے آج تلک، جس نام ونمود میں آئے ہیں
ان میں سے ہر اک رخصت جو ہوا، کیا اس کا پتا جز خاک ملا
اے فرصتِ ہستی کس کو خبر، کس رفت و رود میں آئے ہیں

عمر خیام

چون جود ازل بود مرا انشا کرد
بر من زنخست درسِ عشق املا کرد
و آنگاه قراضہ ریزۂ عشق مرا
مفتاح درِ خزائنِ معنی کرد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جب جود و عطا کے لمحے میں، ہم کو بھی حیات دہر ملی
ے عشق کی سب سے پہلے ملی، تلخ ایسی کہ جیسے زہر ملی
جو قطرہ بھی چھلکا ساغر سے، اس کا بھی عجب اعجاز رہا
معنی کے سمندر تک لائے، مستی کی اک ایسی لہر چلی

عمر خیام

بوسیدہ مرقعہ اند این نامی چند
نا رفتہ رہِ صدق و صفا گامی چند
بگرفتہ ز طامات الف لامی چند
بدنام کنندۂ نکو نامی چند

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جو صدق و صفا سے عاری ہیں، وہ مکر و ریا کے بندے ہیں
بوسیدہ مرقع خامی کے اور حرص و ہوا کے بندے ہیں
الفاظ و حروف کی گردانیں، دن رات ہے شغلِ خاص ان کا
ظاہر میں وفا کے متوالے، باطن میں دغا کے بندے ہیں

عمر خیام

خطی کہ ز روی یار برخاستہ شد
تو ظن نبری کہ حسن او کاستہ شد
در باغ رخش بہر تماشا گہِ جاں
گل بود و بہ سبزہ نیز آراستہ شد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

اس سبزۂ خط سے حسن بڑھا کب کم وہ جمالِ یار ہوا
کچھ اور طراوت دل کی بڑھی، سبزے سے ہوا گلزار ہوا
اس رخ کی بہاریں اور بڑھیں، جلوؤں کی پھواریں اور پڑیں
اس سبزہ و گل کی رفاقت سے، خوابیدہ چمن بیدار ہوا

عمر خیام

در دہر چو آوازہ گلِ تازہ دہند
فرمای پیالہ مے بہ اندازہ دہند
از دوزخ و زبہشت و ز حور و قصور
فارغ بنشیں کہ آں خود آوازہ دہند

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جب باغ جہاں میں پھول کھلیں، بازاروں میں گجرے آنے لگیں
ہر گام نظر کے مقابل میں، مستی کے نظارے چھانے لگیں
دیں حکم سبو و ساغر کا اور سازِ طرب کے نغموں کا
پھر دیکھ فسانے جنت کے کیا رنگِ حقائق پانے لگیں

عمرخیام

در عالمِ جاں بہ ہوش می باید بود
در کارِ جہاں خموش می باید بود
تا چشم و زبان و گوش برجا باشد
بے چشم و زبان و گوش می باید بود

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

غواصی بحرِ صداقت میں لازم ہے بہت کچھ رودز کریں
ہو کارِ جہاں میں کاوشِ جاں لیکن نہ زیادہ شور کریں
لیں کام حواسِ باطن سے، ظاہر کی جو نظریں کام نہ دیں
ہر حال میں ہوش ضروری ہے، جس رنگ میں بھی ہم غور کریں

عمرخیام

ساقی علم سیاہِ شب، صبح ربود
برخیز و مے مغانہ را دردہ زود
بکشائی زہم دو نرگسِ خواب آلودہ
برخیز کہ خفتن بسی خواہد بود

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

وہ ظلمتِ شب کے پرچم سب، انوارِ سحر میں ڈوب گئے
دے جامِ صبوحی اے ساقی، جو رات کے تھے مطلوب گئے
کھول آنکھ سہانا منظر ہے، کلیوں کی چٹک جاں پرور ہے
ہاں وقت یہ وقتِ ساغر ہے، حائل تھے جو سب ناخوب گئے

عمر خیام

بگوار کہ غصہ در حصارت گیرد
و اندوہ محال روزگارت گیرد
مے خور بہ کنار سبزہ و آب رواں
زاں پیش کہ خاک درکنارت گیرد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

کیوں غصہ و غم کے گھیرے ہوں اور رنج و الم کے پھیرے ہوں
کیوں راہ گزرِ خاکی میں، یہ جھگڑے میرے تیرے ہوں
ندی کے کنارے سبزے پر، اے جانِ جہاں ہاں جام چلے
قبل اس کے گورِ خاکی میں، آشفتہ سروں کے ڈیرے ہوں

عمر خیام

زان پیش کہ نام تو زعالم برود
مے خور کہ چو مے رسد بدل غم برود
بکشائی سر زلفِ بتے بند بہ بند
زان پیش کہ بند بندست ازہم برود

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

قبل اس کے کہ اپنا نام مٹے، اس لوحِ وجودِ خاکی سے
مے پی لیں کہ ہر غم جل جائے، ہاں جام کی آتش ناکی سے
زلفوں کو بھی کھول اے یارِ حسیں فتنوں میں مقید کر نہ انھیں
کل سب کو مقید ہونا ہے، دیوارِ مزارِ خاکی سے

عمر خیام

گویند بہ حشر گفتگو خواہد بود
واں یار عزیز تند خو خواہد بود
از خیر محض جز نکوئی ناید
خوش باش کہ عاقبت نکو خواہد بود

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

کہتے ہیں کہ روزِ محشر میں وہ تیزیٔ طبع دکھائے گا
کچھ دھوپ مزاج کی چمکے گی، کچھ قہر کی آگ جلائے گا
لیکن یہ حقائق بھی ہیں اگر، میخانہ کی حد کے اندر ہیں
جب بیچ ہوا تو کون تجھے، کیا رنگ کہاں کا دکھائے گا

عمر خیام

آنہا کہ فلک دیدہ و دہر آرایند
آیند روند و باز با دہر آیند
در دامنِ آسمان و در زیرِ زمیں
خلقے ست کہ باخدائے دہر آسایند

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جو عارفِ رازِ ہستی ہیں، جو دیدہ ورانِ عالم ہیں
آئیں کہ وہ جائیں محفل سے، جاں دادۂ جانِ عالم ہیں
ہوں زیرِ فلک یا زیرِ زمیں، ان سے ہے یہ دنیا خوب و حسیں
خلاقِ جہاں ہے کوئی اگر، یہ خالقِ آنِ عالم ہیں

عمر خیام

در دہر ہر آنکہ نیم نانے دارد
وز بہر نشست آستانے دارد
نہ خادمِ کس بود نہ مخدوم کسے
گو شاد بزی کہ خوش جہانے دارد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جو قوتِ بازو کے بل پر، اک نانِ جویں بھی رکھتا ہے
اور کارِ جہاں میں راحت کا، اک کنج کہیں بھی رکھتا ہے
عزت بھی اسی کو زیبا ہے، جینا بھی اسی کا جینا ہے
مخدوم نہ خادم، انساں ہے اور بختِ حسیں بھی رکھتا ہے

عمر خیام

فردا کہ نصیب نیک بختاں بخشند
قسمی بہ من رندِ پریشاں بخشند
گر نیک آیم مرا از ایشان شمرند
وز بد باشم مرا بدیشاں بخشند

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

بن جائے حقیقت حشر اگر اور سب کا حساب اعمال کا ہو
میخواروں کی صف میں رہ جانا، انجام ہمارے حال کا ہو
انساں صفت میخواروں کے، صدقے میں ہماری بخشش ہو
رندوں کی شفاعت کام آئے اور رنگ حسیں اشغال کا ہو

عمر خیام

در میکدہ جز بہ مے وضو نتواں کرد
واں نام کہ زشت شد نکو نتواں کرد
خوش باش کہ ایں پردۂ مستوری ما
بدریدہ چنین شد کہ رفو نتواں کرد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

میخانہ کے فرشِ رنگیں پر مینا سے وضوئے عشرت ہو
دھرتا ہے وہ جس پر نام جہاں، گردش میں وہ رنگِ فطرت ہو
بدنام سہی دنیا میں مگر ، ہے بادہ کشوں کا نام جہاں
بہتر ہے کہ پردہ اٹھ جائے، تابانی حسنِ صداقت ہو

عمر خیام

این چرخ جفا پیشہ، دغائی بنیاد
ہرگز گرہ بستۂ کس نکشاد
ہر جاکہ یکی دید کہ داغی دارد
داغ دگرش بر سرِ آں داغ نہاد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

کب چرخ وفلک کے قصے نے، مشکل کی گرہ کو کھولا ہے
تقدیر پہ جس کا ایماں ہے، دل اس کا تمام پھپھولا ہے
ہر داغ کے بعد اک داغِ دگر، انجام نہ ہو سمجھے جو کوئی
تقدیر خود اپنے ہاتھ میں ہے، انسان خود اپنا مولا ہے

عمر خیام

آنانکہ محیط فضل و آداب شدند
در کشفِ علوم شمع اصحاب شدند
رہ زیں شب تاریک نبردند بروں
گفتند فسانہ ای و در خواب شدند

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

یکتا جو علوم و فنون میں تھے اور علم و فضیلت رکھتے تھے
ہاں ہاں وہ یگانے اہل ہنر، جو نورِ صداقت رکھتے تھے
مانا کہ وہ آخر ڈوب گئے، تاریکیٔ شب کے پردے میں
لیکن وہ اجالے آج بھی ہیں، جو حسنِ حقیقت رکھتے تھے

عمر خیام

ہم دستِ من تشنہ بہ جامی نہ رسید
ہم پای تمنا بہ مقامی نہ رسید
واں دل کہ بماندہ، بود در ناکامی
ہم عاقبت الامر بہ کامی نہ رسید

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

مانا کہ نہ پہنچے منزل تک اور دل کی تمنا پا نہ ہو سکے
اس روئے زمیں پر جنت کی تشکیل کی حد تک جا نہ سکے
لیکن یہ تسلی کافی ہے، اک دن تو زمانہ پائے گا
وہ جلوہ و کیف و سرمستی جو اہل نظر سمجھا نہ سکے

عمرخیام

از واقعہ ای ترا خبر خواہم کرد
واں را بہ دو حرف مختصر خواہم کرد
باعشق تو در خاک خرد خواہم شد
با مہر تو سر زخاک بر خواہم کرد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہستی کے چمن میں برگِ خزاں کی طرح میں جب ہو جاؤں گا
ہاں خاک کی چادر اوڑھ کے جب نظروں سے نہاں سو جاؤں گا
دیکھو گے تمھارے پیار نے پھر کس طرح سے آنکھیں کھولی ہیں
میں دیدۂ نرگس بن بن کر دیدار طلب ہو جاؤں گا

عمرخیام

روزیست خوش و ہوا نہ گرم است و نہ سرد
ابر از رخِ گلزار ہمے شوید گرد
بلبل بہ زبانِ حال نزد گلِ زرد
فریاد ہمے کند کہ مے باید خورد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

موسم ہے سہانا دن ہے حسیں اور موج ہوا میں مستی ہے
گھر گھر کے گھٹائیں آئیں ہیں ہر سمت پھوار برستی ہے
پھولوں کے دھلے ہیں پھر چہرے نکھرے ہیں چمن کے نظارے
بلبل کی صدا میں مژدہ ہے، میخوار گلوں کی بستی ہے

عمر خیام

اجرام کہ ساکنانِ ایں ایوانند
اسبابِ تردّدِ خرد مندانند
ہاں تا سر رشتۂ خرد گم نکنی
کاناں کہ مدبراند سرگردانند

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

امواجِ حیات، اجرامِ فلک، ایوانِ وجود میں جو کچھ ہے
پیغامِ تفکر دیتا ہے، اندازِ نمود میں جو کچھ ہے
ہاں عقل و خرد کی راہوں میں، فانوس جلا، گمراہ نہ ہو
پیمانہ بکف ہے جامِ بلب، اس رفت و رود میں جو کچھ ہے

عمر خیام

زان پیش کہ گورے زمن آگندہ شود
و اجزای مرکبم پراگندہ شود
اے بادہ سر از گورِ صراحی بردار
باشد کہ دلِ مردۂ من زندہ شود

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

قبل اس کے کہ جسمِ خاکی کے، اجزا سے خمیرِ خاک بنے
ترکیب عناصر ٹوٹ چکے اور قصۂ ہستیِ پاک بنے
بوتل کے اڑائیں کاک یہاں، ساغر میں سبو کی گردن ہو
جو مردہ سے بچتا ہو، لازم ہے اسے بیباک بنے

عُمر خیام

گویند بہ بہشت حورِ عین خواہد بود
وآنجا مئے ناب و انگبیں خواہد بود
گرما مے و معشوق پرستیم رواست
چوں عاقبتِ کار ہمیں خواہد بود

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

کہتے ہیں کہ باغِ رضواں میں، حوروں کا جمال یکتا ہے
ہے شہد و شراب و شیر وہاں، جس سمت بھی کوئی تکتا ہے
جب شوقِ خیالی بھی ہے یہی، تو شغلِ حقیقی کیوں ہو برا
دنیا کی شراب و شاہد پر، زاہد کو یہ کیسا سکتہ ہے

عمر خیام

توبہ مکن از مے اگرت مے باشد
صد تائب بادغات در پے باشد
گل جامہ دراں و بلبلاں نعرہ زنان
در وقت چنین توبہ روا کے باشد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جب تک کہ سبو و ساغر میں، اک قطرۂ مے بھی باقی ہے
ہے موجِ ہوا پیغامِ طرب اور ابر پیامِ ساقی ہے
پھولوں کی گریباں چاکی ہے بلبل کی ترنم سازی ہے
توبہ ہے خوشی کی راہزنی، پرہیز بھی اک قزاقی ہے

عمر خیام

افسوس کہ سرمایہ زکف بیرون شد
در دستِ اجل بسے جگرہا خون شد
کس نامد ازان جہاں کہ تا پرسم ازو
کہ احوالِ مسافرانِ عالم چون شد

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

تاراج خزاں کے ہاتھوں سے، ہر پھول ہر اک گل بوٹا ہے
کتنوں کے متاعِ ہستی کو، قزاق اجل نے لوٹا ہے
کچھ ان کی خبر ملتی ہی نہیں، جو بزمِ جہاں سے دور گئے
کہنے کو تو کتنے سینوں میں، عرفان کا چشمہ پھوٹا ہے

عمر خیام

آنہا کہ کشندۂ شرابِ ناب اند
و آنہا کہ بشب مدام در محراب اند
بر خشک کسے نیست، ہمہ در آب اند
بیدار یکی ست دیگراں در خواب اند

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

وہ جن کی بدولت رہتا ہے گردش میں سبو و پیمانہ
اور وہ جو شب میں ڈھونڈتے ہیں محراب میں حسن جانانہ
اک ناؤ کے سارے مسافر ہیں دریا کے حدوں اندر ہیں
ملاح رہے گا باقی سب، ہو جائیں گے خواب و افسانہ

عمر خیام

گویند کہ ماہِ رمضاں گشت پدید
من بعد بہ گردِ بادہ نتواں گردید
در آخرِ شعباں بخورم چنداں مے
کاندر رمضاں مست بخسپم تا عید

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

وہ دیکھ افق کے جھرو کے میں، پیشانیِ ماہ رقصاں ہے
حرمت کے دنوں کی ساری مے، اک ساتھ جو پی لوں آساں ہے
دے اتنی کہ کیف و مستی ہو، شوال کا چاند ابھرنے تک
ساقی جو خوشی میں حائل ہو، کیا رسمِ فضول ایماں ہے

عمر خیام

ستی مکن و فریضہ حق بگذار
در عہدہ آں جہاں منم بادہ بیار
در خونِ کسی و مال کس قصد مکن
واں لقمہ کہ داری زکساں باز مدار

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہاں رسمِ ستم سے ہاتھ اٹھا، طاعت ہے یہی تقصیر نہ کر
عقبیٰ کا میں ذمہ لیتا ہوں، مے پینے میں کچھ تاخیر نہ کر
جو لقمۂ تر اور دولت و زر انساں کے لہو سے ڈھلے ہیں
دوزخ ہے یہی اور اپنے لیے یہ دوزخِ دل تعمیر نہ کر

عمر خیام

باسفلہ ای تندخو و بے عقل و وقار
زنہار مخور بادہ کہ رنج آرد بار
بدمستی و شور عربدش در شب عیش
دردِ سر و عذر خواہی اش روز شمار

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

کم ظرف مفاد پرستوں میں، بے عقلوں میں لعلِ ناب نہ پی
جو آبِ حیات کو زہر کرے اس بزم سے بچ زہر آب نہ پی
ہنگامۂ ذات و بدمستی، اس رنگِ طرب کے دشمن ہیں
کر ان سے شمار، درد سری، کر کر کے خطا کا حساب نہ پی

عمر خیام

وقتِ سحر است خیز ای طرفہ پسر
پُر بادۂ لعل کن بلوریں ساغر
کیں یکدم عاریت دریں کنج فنا
بسیار بجوئی و نیابی دیگر

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

وہ دیکھ افق کے غرفے میں، انوارِ سحر اے شوخ حسیں
لا بادۂ لعل میخانہ اور جام کو بھر اے شوخ حسیں
یہ موقع عیش غنیمت ہے، اب بادہ کشی کی فرصت ہے
گم پائے گا اک دن ہم کو یہاں، ڈھونڈے گا اگر اے شوخ حسیں

عمرخیام

گر بادہ خوری تو با خرد منداں خور
یا با صنمی لالہ رُخی خنداں خور
بسیار مخور ، فاش مکن، و ترد مساز
اندک خور و گہِ گاہ خور و پنہاں خور

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جو عقل و خرد میں کامل ہیں، کر بادہ خوری ان یاروں میں
معصوم صفت معشوقوں میں، بے مکر و ریا مہ پاروں میں
طاقت سے زیادہ بادہ نہ پی، کر فاش نہ رازِ سرمستی
ہاں اہل فساد سے بچ کر پی، کر شور نہ دنیا داروں میں

عمرخیام

ما عاشق آشفتہ و مستیم امروز
در کوی بتاں بادہ پرستیم امروز
از ہستی خویشتن۔ بہ کلی رُستہ
پیوستہ بہ محراب الستیم امروز

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہم آج ہیں مست و وارفتہ، مستی کے جہاں میں پہنچے ہیں
کوچے میں بتوں کے پہنچے ہیں اور مغ بچگاں میں پہنچے ہیں
آلام کی زد سے نکلے ہیں اور ذات کی حد سے نکلے ہیں
سرشاریٔ جاں کے عالم میں، محرابِ اماں تک پہنچے ہیں

عمر خیام

لب بر لب کوزہ بردم از غایت آز
تا زو طلبم واسطۂ عمر دراز
لب بر لب من نہاد و میگفت براز
مے خور کہ بدین جہاں نمی آئی باز

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

منہ شیشے کے منہ پر رکھ کر جب، میں عالمِ کیف میں جھوم گیا
ہاں کر کے سوالِ عمر دراز، اس منہ کو دوبارہ چوم گیا
پھر مجھ کو یہی محسوس ہوا جیسے کہ یہ سرگوشی میں کہا
مے پی، کہ یہاں سے جو بھی گیا، معلوم کہ نامعلوم، گیا

عمر خیام

ما لعبتگانیم و فلک لعبت باز
از روئِ حقیقتِ نہ از روئ مجاز
بازیچہ ہمی کنیم بر نطع وجود
افتیم بہ صندوقِ عدم یک یک باز

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

سچ مچ کا تماشا خانہ ہے، کب کھیل جہاں کا مجازی ہے
قدرت کے ہیں پتلے حرکت میں، قدرت کی نظارہ بازی ہے
ہستی کی بساطِ حقیقی پر، بازیچۂ ہست و بود ہیں ہم
اظہارِ وجود اخفائے عدم، تکرارِ وجود طرازی ہے

عمر خیام

از جملہ رفتگانِ ایں راہِ دراز
باز آمدہ ای کو کہ بہ ما گوید باز
ہاں برسرِ ایں دوراہا آز و نیاز
چیزے نگزاری کہ نمی آئی باز

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

کب کوئی گزر کر ہستی سے، پھر جامہ ہست میں آیا ہے
یا کوئی جہاں ہے اور اگر، کون اس کی نشانی لایا ہے
دورا ہائے ہست و بود پہ ہم، بہتر ہے کہ سمجھیں رازِ عدم
جو کوئی گیا ہے سوئے فنا، نابود جہاں کا سایا ہے

عمر خیام

کردیم دگر شیوۂ رندی آغاز
تکبیر بہ مے زنیم بر پنج نماز
ہر جا کہ پیالہ ایست ما را بینی
گردن چو صراحی سوئے او کردہ دراز

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

رندوں کا جو شیوہ اپنایا پھر سارے جہاں سے پیار کیا
تکبیر و نماز و روزہ کو ہاں غرقِ جمالِ یار کیا
ہو پیار کی مے کا جام نہ کیوں اور ساتھ ہی مے کا نام نہ کیوں
جس بزم کو دیکھا مے سے تہی، جانے سے وہاں انکار کیا

عمر خیام

رفتند و رفتگان یکی نامد باز
تا با تو بگوید از پسِ پردۂ راز
کارت و نیاز می کشاید نہ نماز
بازیچہ بود نماز بے صدق و نیاز

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جو بزمِ جہاں سے جاتا ہے، وہ لوٹ کے پھر کب آتا ہے
ہے رازِ عدم تو کون یہاں، اس سرِ نہاں کو پاتا ہے
کیا پردہ اٹھے گا عبادت سے، یا رسمِ فضول اطاعت سے
ہاں پیار اگر ہو انساں میں، جینے کا مزہ آجاتا ہے

عمر خیام

با مردمِ پاک اصل و عاقل آمیز
و ز نااہلاں ہزار فرسنگ گریز
گر زہر دہد ترا خرد مند، بنوش
ور نوش رسد ز دستِ نااہل بریز

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

دیکھ اہلِ خرد کی مجلس میں، یہ شغلِ شراب و ساغر ہو
نااہل سے لاکھوں میل پرے، یہ حسن و طرب کا منظر ہو
دے زہر بھی دانا تجھ کو اگر، پی اور ذرا بھی فکر نہ کر
نادان اگر دے آبِ حیات، اس زہر سے شاید بدتر ہو

عمر خیام

برروی گل از ابر نقاب ست ہنوز
در طبع ولم میلِ شراب ست ہنوز
در خواب مرو چہ وقتِ خواب است ہنوز
جاناں مے خور کہ آفتاب است ہنوز

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

پھولوں پہ نقابِ سایہ ہے، گلشن پہ نقابِ سحابی ہے
ہے مے کے لیے ہر دل میں طلب، ماحول تمام شرابی ہے
کیوں نیند کے جھونکے آجائیں، کیوں خواب کے جھولے پڑ جائیں
میخانہ میں سورج کب ڈوبا، کب وقتِ غروب گلابی ہے

عمر خیام

معشوق کہ عمرش چو غم باد دراز
امروز تلطفی بمن کرد آغاز
بر چشم من انداخت دمی چشم و برفت
یعنی کہ نکوئی کن و در آب انداز

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

وہ شوخ کہ جس کو عمر ملے، میرے ہی غموں کی درازی کی
آج اس نے کرم کا فریب دیا، اک لحہ محبت بازی کی
ہنستی ہوئی آنکھیں اس کی تھیں، غم دیدہ نگاہیں میری تھیں
پانی میں ڈبونے والوں کی نیکی پہ عجب طنازی کی

عمر خیام

وقتِ سحر است خیز اے مایۂ ناز
نرمک نرمک بادہ خور و چنگ نواز
کانہا کہ بجانید نپایند دراز
و آنہا کہ شدند کس نمی آید باز

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہنگام سحر ہے جام اٹھا، اے مستِ جمال یکتائی
کہتی ہے صبا اک گیت سنا، تحسینِ کمالِ یکتائی
بچھڑے ہیں جو یار آئیں گے نہیں، ہاں یاد میں ان کی جام چلے
جو اٹھ گئے بزم ہستی سے، ہیں خواب وخیال یکتائی

عمر خیام

یک یک ہنرم بیں و گناہ دہ دہ بخش
ہر جرم کہ رفت حسبۃ اللہ بخش
از باد و ہوا آتش کین را مفروز
ما را بہ در خاک رسول اللہ بخش

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

لے عفو سے کام اور بخش خطا، اس عرضِ ہنر کے بدلے میں
ظاہر کی طرف سے پھیر نظر، باطن کے گہر کے بدلے میں
پاداش کے شعلے کیوں بھڑکیں، کیوں جرم وسزا کی نمائش ہو
ہاں پیار کی مشعل روشن ہو، چاہت کی نظر کے بدلے میں

عمرخیام

بگذار دلا وسوسۂ عقلِ معاش
از ہستیِ خویشتن ہبر چون اوباش
در بزم قلندرانِ معنی بنشین
آزادہ شو و شراب نوش وخوش باش

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہے عقلِ مفادِ ذات عبث، لے کام نہ کچھ عیاری سے
کچھ ہاتھ یہاں آئے گا نہیں، اپنے ہی لیے غم خواری سے
ہاں محفلِ اہلِ معنی میں آزادہ روی کے لطف اٹھا
پی بادہ خوشی کے جام چڑھا، بچ لعنتِ دنیاداری سے

عمرخیام

آں مے کہ حیات جاودانی است بنوش
سرمایۂ لذتِ جوانی است بنوش
سوزندہ چو آتش است لیکن غمِ او
سازندہ چو آبِ زندگانی است بنوش

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

پی بادہ کہ تو بھی فانی ہے، یہ ملکِ بقا کا پانی ہے
مے ہی سے سرورِ ہستی ہے، تابندہ بہارِ جوانی ہے
ہے آگ، مگر ان شعلوں سے، ہر ریشۂ تن کی شادابی
ہے زیست کا نغمہ جو جاں افزا تو دنیا سہانی ہے

عمر خیام

خیام اگر ز بادہ مستی خوش باش
با سادہ رخی اگر نشستی خوشی باش
چوں عاقبت کار جہاں نیستی است
انگار کہ نیستی، چو ہستی خوش باش

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہے بادہ پرستی شغل اگر، یہ شغلِ مسرت کیوں نہ رہے
بیٹھا ہو جو پاس اک خوب نظر، پھر عیش کی چاہت کیوں نہ رہے
آخر کو عدم کی تاریکی ہر ذرے کے دل پر چھائے گی
جب عمر کا ساغر چلتا ہو، فانوسِ محبت کیوں نہ رہے

عمر خیام

غم چند خوری بکار ناآمدہ پیش
رنج است نصیب مردمِ دور اندیش
خوش باش و جہاں تنگ مکن بر دلِ خویش
کز خوردنِ غم قضا نہ گردد کم و بیش

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جو حادثہ پیش آیا ہی نہ ہو، کیوں پہلے سے اس کا کھٹکا ہو
کیوں حد سے زیادہ سوچ بڑھے، کیوں دور دراز اندیشہ ہو
کیوں تنگ لگے میخانہ تجھے، سب تشنہ لبوں کی پیاس بجھا
غم اس کا مقدر ہوتا ہے جو اپنے ہی غم میں بھٹکتا ہو

عمر خیام

از آمدہ ہا زرد مکن چہرۂ خویش
و ز نامدہ ہا آب مکن زہرۂ خویش
بردار ز دنیای دُنی بہرۂ خویش
زاں پیش کہ دہر برکشد دہرۂ خویش

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جو حادثہ پیش آیا ہی نہیں، کیوں پہلے ہی چہرہ زرد کرے
وہ صدمہ جو دل پر آن پڑا، کیوں وہ بھی نمودِ درد کرے
ہاں عشرتِ ہستی جتنی بھی، ممکن ہو عمل سے حاصل کر
قبل اس کے کہ وقت آخر کا برفاب بدن کو سرد کرے

عمر خیام

درکارگہِ کوزہ گراں بودم دوش
دیدم دو ہزار کوزہ گویا و خموش
کے ناگاہ یکی کوزہ بر آورد خروش
کو کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

گذرا جو دکانِ کوزہ سے کل، ہر طرز کا ان میں کوزہ تھا
مٹی کا خمیر بھی ڈھیروں تھا، جو چپ کی زباں میں کہتا تھا
ہم ہی میں انھیں کی خاک بھی ہے، جو کوزہ بناتے رہتے تھے
وہ بھی جو خریدا کرتے تھے، دن رات ہی جن کا پھیرا تھا

عمر خیام

مے گرچہ حرام است مدامش می نوش
بانغمہ و چنگ صبح و شامش می نوش
جامی زمے لعل گرت دست دہد
یک قطرہ رہا مکن تمامش می نوش

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

اس عہدِ خرد میں آخر کیوں، یوں فکرِ حلال و حرام کریں
ہاں نغمۂ و مے کا شغل یہاں، ہر صبح کریں ہر شام کریں
ہاں لعلِ نگار نازک سے، تیز اور بھی کیفِ جام کریں
جو موسمِ گل کے شایاں ہے، لازم ہے کہ ہم وہ کام کریں

عمر خیام

خیام زمانہ از کسے دارد ننگ
کاو در غمِ ایام نشیند دل تنگ
مے خور تو در آبگینہ بانالۂ چنگ
زاں پیش کہ آبگینہ آید برسنگ

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

رندانِ جہاں سے کیوں ہو الگ، کیوں شکوۂ اہلِ دنیا ہو
دل تنگ ہوں کیوں آزادوں سے، کیوں غم کی ہوائے صحرا ہو
ہر وقت ہے وقتِ خوش باشی، ہر وقت ہے وقتِ بادہ کشی
قبل اس کے کہ اپنا شیشہ بھی، پتھر پہ قضا نے پٹکا ہو

عمر خیام

چون باد بزلفِ او رسیدن مشکل
و ز دستِ غمش عناں کشیدن مشکل
گفتند بدیدہ روی او بتواں دید
گر دیدنِ ماست، دیدہ دیدن مشکل

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

پہنچیں جو کسی کے گیسو تک، یہ ہاتھ ہمارے، مشکل ہے
اور اپنی طلب کے سفر کا غم وہ دل سے اتارے، مشکل ہے
آنکھوں میں نہاں ہو جب کوئی، پھر ہم سا کوئی بھی اہل نظر
اپنی ہی نظر سے اپنی ہی، آنکھوں کو گزارے، مشکل ہے

عمر خیام

یک چند بہ کودکی باستاد شدیم
یک چند ز استادی خود شاد شدیم
پایانِ سخن شنو کہ ما را چہ رسید
از خاک در آمدیم و برباد شدیم

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

اک عہد وہ طفلی کا تھا جب، مکتب کی سبق خوانی میں رہے
پھر عہد جوانی آیا تو استادی کی جولانی میں رہے
اک وہ بھی زمانہ آئے گا جو ہم کو فسانہ پائے گا
خاک اپنی درآمد یوں ہوگی جیسے کہ پریشانی میں رہے

عمر خیام

اے مفتیٔ شہر از تو پرکار تریم
با ایں ہمہ مستی از تو ہشیار تریم
تو خونِ کساں خوری و ما خونِ رزاں
انصاف بدہ کدام خونخوار تریم

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

اے مفتیِ شہر اے شیخِ حرم، ہاں تم سے سوا پرکار ہیں ہم
ہم مست سہی غافل بھی سہی، تم سے تو بہت ہشیار ہیں ہم
ہم رز کا لہو پیتے ہیں یہاں، اور دولتِ مستی پاتے ہیں
تم خونِ بشر پی جاتے ہو، خونخوار ہو تم مے خوار ہیں ہم

عمر خیام

ما خرقۂ زہد در سر خُم کردیم
و ز خاک خرابات تیمم کردیم
باشد کہ درونِ میکدہ دریابیم
عمری کہ درونِ مدرسہ گم کردیم

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

میخانہ کی گردِ فرش سے کی، تزئین تیمم مستی میں
چپ چاپ گرے ہیں سجدے میں، دیکھا جو کوئی خم مستی میں
جس یار کو برسوں گزرے ہیں کھویا تھا عبادت خانے میں
سوچا کہ وہ شاید مل جائے میخانے میں گم مستی میں

عمر خیام

گل گفت کہ من یوسف مصر چمنم
یاقوتِ گراں مایۂ پرزر دہنم
گفتم چو تو یوسفی نشانی بنمائی
گفتا کہ بخون غرق نگر پیرہنم

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

اک گل نے کہا، میں یوسف ہوں اور مصرِ چمن میں رہتا ہوں
ہے میری زلیخا پھلواری، یوں حسن کے بن میں رہتا ہوں
پوچھا کہ ثبوت؟ اس نے یہ کہا "یہ جامۂ رنگین چاک زدہ"
پھر چپ کی زباں میں دہرایا، میں یادِ وطن میں رہتا ہوں

عمر خیام

تاچند اسیرِ عقل ہر روزہ شویم
در دہر چہ صد سالہ چہ یک روزہ شویم
دردہ تو بکاسہ مے، ازاں پیش کہ ما
درکارگہِ کوزہ گراں کوزہ شویم

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

کیوں عقلِ غرض پرور سے یہاں دنیا کا خلوص خراب کریں
اس سے تو زیادہ بہتر ہے، جو عمر ہے نذرِ شراب کریں
سو سال جئیں ہم یا اک دن، ہر لمحہ ہو وقفِ خوش بسری
اک روز خود اپنی مٹی سے، ہاں جام بنے گا شتاب کریں

عمر خیام

من نوش کنم و لیک مستی نکنم
الا بقدح دراز دستی نکنم
دانی غرضم زمے پرستی چہ بود
تا ہمچو تو خویشتن پرستی نکنم

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

مانا کہ میں پیتا رہتا ہوں، بچتا ہوں مگر بد مستی سے
مطلوب نہیں جز مے کے سوا، اس باغ و بہار ہستی سے
بس جام و سبو پر چلتا ہے، شعلہ سا نظر میں ڈھلتا ہے
کرتا ہوں اجالے، بچتا ہوں ظلماتِ مفاد پرستی سے

عمر خیام

یک دست بہ مصحف ایم و یک دست بہ جام
گہ مردِ حلالیم و گہی مردِ حرام
مائیم دریں گنبدِ فیروزہ فام
نے کافرِ مطلق نہ مسلمانِ تمام

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

اک ہاتھ میں اپنے مصحف ہے، اک ہاتھ میں اپنے ساغر ہے
بے دینی و دیں کی سرحد پر، میخانہ کا رنگیں منظر ہے
اس سقفِ فلک کے نیچے ہم، آزاد روی کے پیامی ہیں
ہر کام ہے اپنا انسانی، ہاں دیر و حرم سے ہٹ کر ہے

عمر خیام

یک روز ز بندِ عالم آزاد نہ ام
یک لحظہ من از وجود خویش شاد نہ ام
شاگردی روزگار کردم بسیار
در دورِ جہاں ہنوز استاد نہ ام

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

آزادرہے اک دن بھی نہ ہم، اغراض وہوس کے بندھن سے
اک موجِ مسرت تک نہ اٹھی، اس اپنے وجود کے گلشن سے
گر سیکھے مفادِ ذاتی کے اور کام کسی کے آ نہ سکے
کچھ کارِ جہاں تو کر نہ سکے، الجھے ہیں خود اپنے تن من سے

عمر خیام

برخیز و بیا کہ چنگ بر چنگ زنیم
مے باز خوریم و نام برنگ زنیم
چوں بادہ خوریم در خرابات خوریم
ویں شیشۂ نام و ننگ برسنگ زنیم

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

اٹھ ساز پہ پھر مضراب لگا، نغمات کے شعلے برسا دے
اک شعلہ سیال ایسا پلا، جو دل کی فضا کو گرما دے
میخانہ تو مے کے نام سے ہے اور بادہ کشی کے کام سے ہے
ہاں شیشۂ ننگ و نام یہاں، پتھر پہ پٹک اور بکھرا دے

عمر خیام

آن آہ کہ پیش ہیچ محرم نزنم
وان دم کہ بہ پیش ہیچ ہمدم نزنم
گر دریابم کہ جز تو کس می شنود
حقا کہ بمیرم از دم و دم نزنم

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

محرم نہ ملا جو کوئی ہمیں افسردہ نفس کو روکا ہے
ہمدم نہ ملا جو کوئی ہمیں، تو سازِ جرس کو روکا ہے
جز تیرے کسی نے بھی نہ سنی، وہ آہ جو دل سے اٹھتی ہے
جو آگ چمن میں بھڑکاتا، اس شعلۂ خس کو روکا ہے

عمر خیام

ہنگامِ گل است اختیاری نہ کنم
وآنگہ بخلافِ شرع کاری نہ کنم
با سبزی خطاں لالہ رخاں، روزی چند
بر سبزہ زجرعہ لالہ زاری نہ کنم

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہے موسمِ گل دل بے قابو مستی وجوشِ طبیعت ہے
مشروع و شرع کا قصہ کیا، فطرت کی خود اپنی شریعت ہے
پھولوں کے ہیں دن آ پھول چنیں اور جام پئیں ہم سبزے پر
یہ فصل گلاب وگلابی ہے، ہاں جوش پہ رنگِ حقیقت ہے

عمر خیام

زین گونہ کہ من کار جہاں می بینم
عالم ہمہ رائگاں بران می بینم
سبحان اللہ بہر چہ در می بینم
ناکامی خویشتن درآں می بینم

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جب رہ کے خیالی عالم میں، دنیا پہ نگاہیں ڈالی ہیں
بے وقعتی ہستی کے لیے خود کتنی راہیں نکالی ہیں
حالانکہ مرادیں پانے کی منزل سے تو ساغر دور نہیں
کیوں مے میں نظر آئیں نہ ہمیں شکلیں جو تمام کمالی ہیں

عمر خیام

در راه تو تا اسپ طرب تاختہ ایم
با عیش و طرب و مے نہ پرداختہ ایم
قصہ چہ کنم باب نشناختہ ایم
در منزلِ دزد آشیاں ساختہ ایم

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جب شوقِ طرب کا طیارہ، پرواز میں لائے اے جاناں
عشرت کی فضائیں مل نہ سکیں، ہچکولے بھی کھائے اے جاناں
منزل نہ ملی، اڑتے ہی رہے اور آخر کار تمام ہوئے
بستی میں گرے ہم چوروں کی، تم ہاتھ نہ آئے اے جاناں

عمر خیام

برمفرش خاک خفتگان می بینم
در زیرِ زمین نہفتگان می بینم
چندان کہ بہ صحرایِ عدم می نگرم
نا آمدگان و رفتگان می بینم

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

مٹی میں بہت سے پھول ملے اور کتنے گہر بھی خاک ہوئے
کتنوں کی قبائیں تار ہوئیں اور جامۂ ہستی چاک ہوئے
کیا شہر وجود و دشتِ عدم، بس آمد ورفتِ انساں ہے
جو خون کے رسیا جاہ طلب آئے تھے سو وہ بھی ہلاک ہوئے

عمر خیام

من ظاہرِ نیستی و ہستی دانم
من باطنِ ہر فراز و پستی دانم
بایں ہمہ از دانشِ خود شرمم باد
گر مرتبہ ای ورای مستی دانم

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہستی کا جو ظاہر و باطن ہے، وہ میری نظر میں رہتا ہے
ہر پست و بلند نظارہ، عرفاں کے سفر میں رہتا ہے
ہے ناز بھی علم و دانش پر لیکن وہی وجہِ نازش ہے
جو مست نگاہی بن بن کر اندازِ نظر میں رہتا ہے

عمر خیام

در مسجد اگرچہ بانیاز آمدہ ایم
حقا کہ نہ از بہر نماز آمدہ ایم
ز اینجا روزی سجادہ ای دزدیدیم
آن کہنہ شد است دوبارہ باز آمدہ ایم

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

مسجد میں اگر ہم آئے ہیں، کب سر کو جھکانے آئے ہیں
ہم ایسے کہاں کے نمازی ہیں، کب زہد دکھانے آئے ہیں
پہلے بھی یہاں جب آئے تھے، سجادہ اڑانے آئے تھے
اک وہ بھی متاعِ کہنہ ہے، اک اور اٹھانے آئے ہیں

عمر خیام

گویند مرا کہ مے پرستم، ہستم
گویند مرا عارف و مستم، ہستم
در ظاہر من نگاہ بسیار مکن
کاندر باطن چنانکہ ہستم، ہستم

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

میں اہلِ جہاں کی نگاہوں میں، اک حسن پرست شرابی ہوں
ہاں عارفِ رازِ ہستی ہوں، تجسیم نگاہِ عقابی ہوں
ظاہر میں بھی رنگِ باطن ہے، جس طرح کہ مے ہو شیشہ میں
بے وجہ نہیں ہے جو ہر دم وارفتۂ حسنِ گلابی ہوں

عمر خیام

مقصود ز جملہ آفرینش مائیم
در جسمِ خرد جوہرِ بینش مائیم
ایں دائرۂ جہاں چو انگشتری است
بی ہیچ شکے نقش نگینش مائیم

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

تخلیق کا مقصد ہے جو کوئی، تکمیلِ بشر کی منزل ہے
اور عقل و خرد کے عناصر سے تشکیلِ نظر کی منزل ہے
ہم نقش و نگینِ ہستی ہیں، دانا بھی ہمیں بینا بھی ہمیں
تزئینِ جہاں بھی ہم سے ہے، ہم ہی سے سفر کی منزل ہے

عمرخیام

با زلف تو گر دست درازی کردم
از روی حقیقی نہ مجازی کردم
در زلفِ تو دیدم دلِ دیوانۂ خویش
من با دل خویش دست بازی کردم

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

بہلا جو تمھارے گیسو سے، یہ شغلِ حقیقت رکھتا تھا
کچھ رنگ مجاز و خواب نہ تھا، جب تم سے محبت رکھتا تھا
دل تیری وفا کا گھائل تھا، میں تیری وفا کا سائل تھا
یہ پیار صداقت رکھتا ہے، یہ پیار صداقت رکھتا تھا

عمرخیام

جاناں من و تو نمونۂ پرکاریم
سر گرچہ دو کردہ ایم یک تن داریم
بر نقطہ روا نیم کنوں دائرہ وار
تا آخرِ کار سر بہم باز آریم

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہم دونوں میں نکتے پرکاری، پرکار وجود روانہ ہے
ہم دائرہ ہستی میں ہیں اک انداز اگرچہ یگانہ ہے
کیوں مل کے نہ اک آواز بنیں، نغماتِ طرب پرواز رہیں
کہتی ہو جدا ہر ایک صدا، وہ خردِ وجود ترانہ ہے

عمر خیام

برسینۂ غم پذیرِ من رحمت کن
برجان و دلِ اسیرِ من رحمت کن
برپائے خرابات روِ من بخشائے
بردستِ پیالہ گیرِ من رحمت کن

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جو غم کے دھوئیں سے گھٹتا ہے اس سینہ و جاں کو راحت دے
اس قلبِ تپاں کو راحت دے، نخچیرِ بتاں کو راحت دے
میخانہ کی جانب جب بھی قدم، اٹھ جائیں تو اپنا ہاتھ بڑھا
جب پیالہ اٹھاؤں، جھوم کے بھر، اور سوختہ جاں کو راحت دے

عمرخیام

این چشم پیاله بین بجان آبستن
ہچوں سمنی بہ ارغواں آبستن
نے نے غلطم کہ بادہ از غایتِ لطف
آبے ست بہ آتش رواں آبستن

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جن آنکھوں میں رنگِ ساغر ہے وہ رنگ فسوں سے بڑھ کر ہے
جیسے کہ سمن بر شاہد پر، تابندہ شفق کا منظر ہے
لیکن یہ نہیں مے شے ہے عجب، اور اس کا بیاں ہے نکتہ طلب
ہے آبِ رواں میں آگ نہاں، یا آگ ہے، جو آب آور ہے

عمرخیام

احوالِ جہان بر دلم آسان می کن
و افعالِ بدم زخلق پنہاں می کن
امروز خوشم بدار و فردا با من
آنچہ از کرم توی سزد آن می کن

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہے کوئی کریم و رحیم اگر، مشکل کو نہ کیوں آسان کرے
کیوں میری خطاپوشی نہ کرے، بخشش کا نہ کیوں سامان کرے
پُر آج کا دن خوشیوں سے رکھا، توکّل کا بھی دامن یوں ہی بھرے
ہوتا ہے جو مجھ سے کرتا ہوں، جو اس سے بنے ہر آن کرے

عمر خیام

حق جانِ جہانست و جہاں جملہ بدن
و اصنافِ ملائکہ حواسِ آں تن
افلاک عناصر و موالید اعضاء
توحید ہمین است و دگرہا ہمہ فن

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہر زندہ بدن میں جاری ہیں امواجِ حیاتِ ربانی
قدسی ہیں حواسِ انسانی، ہر تن میں ظہورِ یزدانی
افلاک و عناصر اجزا ہیں ذی جان سب اس کے اعضا ہیں
ممکن ہی نہیں کچھ اس کے سوا توحید کی شکلِ امکانی

عمر خیام

آں را کہ وقوف است بر احوالِ جہاں
شادی و غم و رنج بر او شد آساں
چوں نیک و بد جہاں بسر خواہد شد
خواہی ہمہ درد باش، خواہی درماں

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جو واقفِ رازِ حقیقت ہے، احوالِ جہاں کا دانا ہے
آسان ہے اس کے ہاتھوں میں، دکھ سکھ کا جو تانا بانا ہے
کیوں اپنے ہی غم میں کھو جائے، انجام پہ جس کی نظریں ہوں
سکھ میں ہو بسر یا دکھ میں کٹے، یہ زیست تو آنی جانی ہے

عمر خیام

اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من
وین حرف معمہ نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پس پردہ گفتگوی من و تو
چون پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہاں رازِ وجودِ سرِ ازل، مانا کہ نہ سمجھے آج تلک
ہاں یہ بھی بجا حل ہو نہ سکے، کتنے ہی معمے آج تلک
غفلت کی یہ گہرا ابہام کی دھند چھٹ جائے گی آخر نظروں سے
اک دن تو بالآخر اٹھیں گے، جو پردے نہ اٹھے آج تلک

عمر خیام

زین گنبدِ گردندہ بد افعالی ہیں۔
وز جملہ دوستانِ جہاں خالی ہیں
تا بتوانی تو یک نفس خرم باش
فردا مطلب گزار و دی حالی ہیں

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

دل پر ہیں بہت سے زخم یہاں، اس چرخِ کہن کے ہاتھوں سے
صدمے بھی بہت سے اٹھائے ہیں اہلِ صدق سے عاری یاروں سے
اب دھن ہے یہی سب شاد رہیں اور سب کو خوشی کی راہ ملے
کیوں بے عملی میں زیست ڈھلے، آئندہ کی بوجھل فکروں سے

عمر خیام

صیاد تو حدیث نخچیر مکن
چیزی که نا خوانده تو تفسیر مکن
چوں پیر حقیقت از تو معنی طلبد
از دیدہ بگن ادا و تقریر مکن

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہیں صید نہ ہم صیاد یہاں، کیوں ذکرِ شکار و شکاری ہو
دامن ہو کسی کا یا صحرا، کیوں خوں سے نقش ونگاری ہو
جو خواب کبھی دیکھا ہی نہیں، تعبیر ہو اس کی کیوں لازم
آنکھوں سے لٹائیں پیار یہاں، اور پیار کی بات ہماری ہو

عمر خیام

مسکین دلِ درد مندِ دیوانۂ من
ہشیار نہ شد ز عشقِ جانانۂ من
روزی کہ شرابِ عاشقی می دادند
در خونِ جگر زدند، پیمانۂ من

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

دل اپنا تھا مسکیں بے پروا، دیوانہ صفت محروم رہا
محبوب وحبیب کی رمزوں کا، گم اس پہ ہر اک مفہوم رہا
جب سب میں شرابِ عشق بٹی، یوں ہم کو پا کر بے خبری
پُر خونِ جگر سے جام ملا اور درد سے پُر مقسوم رہا

عمر خیام

نیک است بنامِ نیک مشہور شدن
عار است زجورِ چرخ رنجور شدن
مخمور بہ بوی آب انگور شدن
بہ ز آنکہ بہ زہدِ خویش مغرور شدن

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

اچھا ہے کہ نامِ نیک رہے، خوبوں کا بھی ہم کو سودا ہو
دنیا کی شکایت کیوں کیجیے، کیوں جورِ فلک کا شکوہ ہو
ہاں مستِ شرابِ ناب رہیں اور کیف میں ہم غرقاب رہیں
کیوں زہد کا ہم کو زعم رہے، کیوں ہم کو غرورِ تقویٰ ہو

عمر خیام

تا بتوانی خدمت رنداں می کن
بنیادِ نماز و روزہ ویراں می کن
بشنو سخنِ راست ز خیامِ عمر
مے می خور و رہ می زن و احسان می کن

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

مقدور جو تجھ کو ہو جائے، رندانِ جہاں کی خدمت کر
تکبیر و نماز و روزہ کی بنیاد کو ڈھا کے محبت کر
پی عشق کے ساغر جی بھر کر اور بادہ کشوں کی رفاقت میں
ہر راہِ غرض کو ویراں کر، ہر جنسِ ہوس کو غارت کر

عمر خیام

قومی متفکر اند در مذہب و دیں
جمعی متحیرند در شک و یقیں
ناگاہ منادی ای درآید ز کمیں
کای بی خبراں، راہ نہ آنست و نہ ایں

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

قوموں کے ہیں اب بھی سرمایے، یہ مذہب و دیں کے ہنگامے
انداز تحیر باتوں کے اور شک ویقیں کے ہنگامے
لیکن یہ سحر کی منادی ہے، یہ راہ تو ظلمت زادی ہے
اے بے خبر وان سے تو بھلے اک شوخ حسیں کے ہنگامے

عمر خیام

کہ ز تو گزشتہ شد یاد مکن
فردا کہ نیامدست فریاد مکن
از آمدہ و بگذشتۂ خود یاد مکن
حالی خوش باش و عمر برباد مکن

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

گزرے ہوئے دن کیوں یاد کریں، آئندہ کا کیوں غم آج کریں
اندیشۂ فردا کر کر کے کیوں آہ و فغاں ہم آج کریں
یہ حال کا لمحہ غنیمت ہے، یہ سوقع جہد مسرت ہے
جو بیت گیا سو بیت گیا، آ عیش فراہم آج کریں

عمر خیام

بشنو زمن اے زبدۂ یارانِ کہن
اندیشہ مکن زین چرخِ بے سر و بن
بر گوشہ عرصۂ قناعت بنشیں
بازیچۂ چرخ را تماشای کن

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

اے یارِ حسیں، اے شعلہ جبیں، اے جانِ جہانِ غم خواری
اندیشہ نہ کر کیا دکھلائے، اس چرخ کی مردم آزادی
اغراض کے گندے جوہڑ سے، رہ دور، وفا پہ قانع ہو
پھر کھیل تماشے دیکھ ذرا، اور اہلِ غرض کی عیاری

عمر خیام

گر بر فلکم دست بدے چوں یزداں
برداشتمے من این فلک را ز میاں
و ز نو فلکے دگر چناں ساختمے
کآزادہ بکام دل رسیدے آساں

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہاں مجھ کو جو قدرت ہو جاتی، تقدیرِ جہاں کو بنانے کی
بنیاد فلک کی مٹ جاتی اور رسم بشر کو مٹانے کی
اک بزمِ حیاتِ نو بنتی، عشرت کی مسلسل ہو چھتی
جاویدِ محبت ہو جاتی، تمہید مرادیں پانے کی

عمر خیام

دی شب از سرِ صدق و صفای دلِ من
در میکده آں روح فزای دلِ من
جامی بمن آورد که بستان و بنوش
گفتم نخورم، گفت برای دل من

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جو ذہن کو روشن کرتی ہے اور دل کو بڑھانے والی ہے
نظروں کو جلا دیتی ہے جو شے اور جوش جگانے والی ہے
کل پیار سے اک گل رو نے کہا، اک جام ہماری خاطر بھی
یہ شے جو جہاں کا حاصل ہے اور غم کو بھلانے والی ہے

عمرخیام

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو؟
آنکس کہ گنہ نہ کرد چون زیست بگو؟
من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرقِ میانِ من و تو چیست بگو؟

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہے دہر کے افسوں خانہ میں ناواقفِ عصیاں کون بتا؟
ناکردہ گنہ کس طرح جیا، ایسا ہے وہ انساں کون بتا؟
مجھ سے جو برائی سرزد ہو اور تو جو سزا دے وہ بد ہو
پھر مجھ میں تجھ میں فرق کرے بالطف فراواں کون بتا؟

عمرخیام

آن قصر کہ بر چرخ ہمی زد پہلو
بر در گہہ او شہاں نہادندی رو
دیدم کہ بر کنگرہ اش فاختہ ای
بنشستہ ہمی گفت کہ کو، کو، کو

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

وہ قصر کہ جن کے بام کبھی، افلاک سی رفعت رکھتے تھے
اور خونِ بشر کے متوالے باشان امارت رکھتے تھے
اک ایسے محل کے کھنڈر پر کل اک فاختہ گویا کہتی تھی
باقی ہے بشر لیکن ہیں کہاں جو نخوت و سطوت رکھتے تھے

عمر خیام

چوں بادہ خوری ز عقل بیگانہ مشو
مدہوش مباش وجہل را خانہ مشو
خواہی کہ مئے لعل حلالت باشد
آزارِ کسی بجو و دیوانہ مشو

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

دامانِ خرد کو چھوڑ نہ دے، جب دور میں ساغر آجائے
لازم نہیں مے کے پینے سے انسان کو چکر آجائے
ناموس بشر کا پاس رہے، تعمیرِ جہاں کی آس رہے
جو باغِ جہاں کو بننا ہے، آنکھوں میں وہ منظر آجائے

عمر خیام

بردار پیالہ و سبو اے دلجو
برگرد بہ گردِ سبزہ زار و لبِ جو
کین چرخ بسی قد بتانِ مہ رو
صد بار پیالہ کرد و صد ابار سبو

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ندی کے کنارے سبزے پر، سامانِ طرب کو جمع کریں
ہاں ساز وسبو و پیمانہ، مہتاب میں سب کو جمع کریں
ہر دورِ فلک میں لاکھوں ہی، مٹی میں ملے اور خاک ہوئے
خوبوں کو سنا کر یہ نکتہ، ہر صبح کو، شب کو جمع کریں

عمر خیام

اے دل زغمِ جہاں کہ گفت خون شو
یا ساکنِ عشوہ خانہ گردوں شو
دانی چہ کنی چونیس سامانِ مقام
انکار دروں نیامدی وبیروں شو

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

آلامِ جہاں کا ہر نشتر کیوں دل کے لہو سے رنگیں ہو
اور عشوۂ چرخِ گردوں سے، ہر فردِ بشر کیوں غمگیں ہو
سامانِ بقا حاصل جو نہیں، اس بزمِ فنا میں بہتر ہے
باہر ہو حصارِ ذاتی سے، توحیدِ بشر کا آئیں ہو

عمر خیام

این چرخِ فلک بہر ہلاکِ من و تو
قصدے دارد بجانِ پاکِ من و تو
بر سبزہ نشین، پیالہ کش، دیر نماند
تا سبزہ بروں دمد ز خاکِ من و تو

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

پیمانۂ عمر فانی کو لبریز بالآخر ہونا ہے
سرمایہ حسن و جوانی کو مٹی کے عوض میں کھونا ہے
ہاں سبزہ و گل ہے سیر طلب کچھ دور نہیں وہ دن بھی کہ جب
خود سبزہ میں ڈھل کر آنا ہے اور خاک میں پھر سے سونا ہے

عمر خیام

سر از ہمہ ناقصاں گراں داری تو
راہ از ہمہ ابلہاں نہاں داری تو
بنگر کہ میانِ مرد ماں کار تو چیست
چشم از ہمہ مردماں ہماں داری تو

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ناپختہ و خام انسانوں سے، مانا کہ گریزاں رہتا ہے
اور بے خردوں کی نظروں سے، سو طرح سے پنہاں رہتا ہے
ہاں دیکھ ہجومِ خلائق میں، کیا تیری بصیرت کہتی ہے
کس کی ہے طلب اور کس کے لیے بیتاب و پریشاں رہتا ہے

عمر خیام

از درسِ علوم جملہ بگریزی بہ
واندر سر زلفِ دلبری آویزی بہ
زان پیش کہ روزگار خونت ریزد
تو خون قرابہ در قدح ریزی بہ

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہاں جملہ علوم سے بہتر ہے شیریں دہنوں کی بات آئے
عارض کی چمکتی دھوپ آئے زلفوں کی مہکتی رات آئے
جو خوں کی مانند آتش ہے بھر جام میں پیہم مینا سے
قبل اس کے کہ تھک کر گر جائے، جب رہ میں اجل کی گھات آئے

عمر خیام

گر اسپ و براق است و گر فیروزہ
مغرور مشو بہ دولتِ دہ روزہ
از قہر فلک ہیچ کسی جان نبرد
امروز سبو شکست و فردا کوزہ

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

راکٹ کی سواری لے کے اگر آفاق میں ہر سو اڑتا ہو
ممکن نہیں پھر بھی تا بہ ابد، حاصل تجھے سیر دنیا ہو
مغرور نہ ہو نخوت نہ دکھا، اس شیشہ و مے کی دنیا میں
ہر جامِ شکستہ ایک جہاں معنی ہے جو تو نے سمجھا ہو

عمر خیام

در مجلس عشاق نشستیم ہمہ
از محنتِ ایام برستیم ہمہ
از بادۂ شوقش قدحی نوشدیم
آزادہ و آسودہ و مستیم ہمہ

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

عشاقِ جہاں کی محفل میں، ہر ایک کے ہم دمساز رہے
دنیا کے غموں سے بچ کے رہے، یک جان رہے ہم راز رہے
ہاں عشقِ بشر کے بادہ سے، ہر اک نے بقدرِ ظرف چکھی
آزاد رہے آسودہ رہے اور مستِ شرابِ ناز رہے

عمر خیام

شیخی بہ زنی فاحشہ گفتا مستی
کز خیر گسستی و بہ شر پیوستی
زن گفت چناں کہ می نمایم ہستم
تو نیز چناں کہ می نمائی ہستی

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

اک فاحشہ سے زاہد نے کہا یہ مستی فسق و فجوری ہے
یہ شر سے جو ہے پیوند ترا اور خیر سے یہ جو دوری ہے
شوخی سے جواب اس نے یہ دیا جو کچھ ہوں دکھائی دیتی ہوں
کیا آپ کے ظاہر و باطن میں یکساں ہی شراب طہوری ہے

عمر خیام

ابریق مے مرا بشکستی ربی
برمن در عیش را بہ بستی ربی
بر خاک بریختی مے لعل مرا
خاکم بدہن چو گویمت مستی ربی

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

توڑا سربزم عشرت کیوں مینائے مے رنگیں مرا
در عیش محل کا بند کیا دل سخت کیا غمگیں مرا
میں بے خود و مستی مائل تھا، کیا میری طرح تو غافل تھا
خاکم بدہن کیا تجھ کو کہوں رب بھی ہے شراب آگیں مرا؟

عمر خیام

آنہا کہ زپیش رفتہ اند اے ساقی
در خاک غرور خفتہ اند اے ساقی
رو بادہ خور و حقیقت از من بشنو
باداست ہر آنچہ گفتہ اند اے ساقی

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جو لوگ روانہ ہو بھی چکے اس دیرِ کہن سے اے ساقی
ہیں خوابِ ابد میں گزریں گے کب صحنِ چمن سے اے ساقی
لا، بادہ کہ پی کر ہم چہکیں، اور رازِ حقیقت کہہ بھی سکیں
بے موج ہوا جو کوئی گیا، اس بزمِ سخن سے اے ساقی

عمر خیام

در دہ قدحی ز لعل ناب اے ساقی
برگیر ز آتشم بہ آب اے ساقی
تا عقل گریبان دلم خواہد داشت
دستِ من و دامانِ شراب اے ساقی

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

غم جس سے اترے اس دارو سے اک پیالہ ادھر بھی اے ساقی
اس آتشِ تسکیں پرور کا، اک جامِ دگر بھی اے ساقی
کیوں عقلِ غرض پرور کی عناں، جذبوں پہ رہے ہاں جام چلے
دامانِ کرم دائم ہو ترا، اور مے کا نگر بھی اے ساقی

عمر خیام

ما و مے و معشوق و صبوح اے ساقی
از ما نہ بود توبۂ نصوح اے ساقی
تاکے خوانی قصۂ نوح اے ساقی
پیش آر سبک راحتِ روح اے ساقی

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

مے سامنے ہو مہ رخ بھی رہے ہر صبح صبوحی ہوجائے
ہر روز ہو نذرِ جام و سبو، توبہ جو نصوحی ہوجائے
ماضی کے فسانے اے ساقی دہرانے سے حاصل کیا ہوگا
بہتر ہے کہ غرقِ بحرِ طرب ہر روحی و نوحی ہوجائے

عمر خیام

شمع است و شراب و ماہتاب اے ساقی
شاہد ز شراب ہم خراب اے ساقی
از خاک بر آر این دل پر آتش را
برباد مدہ بیار آب اے ساقی

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

مہتاب و شرابِ احمر ہے اور شمع منور اے ساقی
وہ بت بھی خرابِ ساغر ہے، کیا خوب ہے منظر اے ساقی
خاکسترِ غم میں دل ہے پڑا، ہاں دیکھ وہ کیا شعلہ سا اٹھا
بھر بھر کے سبو، جی بھر کے بہا، تلخاب معطر اے ساقی

عمر خیام

ہنگامِ صبوح ست، خروش اے ساقی
ما و مے و کوئے مے فروش اے ساقی
چہ جائے صلاح ہست خموش اے ساقی
بگذر ز حدیثِ زہد و نوش اے ساقی

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہے وقتِ صبوحی اے ساقی ہنگامِ خروش مستانہ
ہے موج میں کوئے میخانہ اور بادہ فروش مستانہ
کیوں نذرِ صلاح ومشورہ ہو اور وقفِ حدیث وتقویٰ ہو
یہ رنگِ صباح ئے نوشی، یہ موقعِ جوش مستانہ

عمر خیام

درسنگ اگر شوی چونار اے ساقی
ہم آب اجل کند گذار اے ساقی
خاکیست جہاں، غزل بخواں اے مطرب
باد است نفس بادہ بیار اے ساقی

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ڈھونڈیں گے جو ساقی جائے اماں ایوانِ بلند وبالا میں
سیلابِ فنا ڈھائے گا انھیں ہر وادی و کوہ وصحرا میں
اس راہ گزارِ خاکی میں، اے مطربِ دوراں، چھیڑ غزل
ہے سانس ہوا پیمانہ اٹھا، لا گردشِ پیہم صہبا میں

عمر خیام

چون ہست زمانہ در شباب اے ساقی
برخیز بکلم جامِ شراب اے ساقی
ہنگام صبوح قفل بر در زدہ ام
مے دہ کہ برآمد آفتاب اے ساقی

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

لا بادہ کہ روئے ہستی پر پھر رنگِ بہار شبابی ہے
دے جام کہ اک اک ذرے میں، اندازِ خرام شرابی ہے
ہے قفل درِ میخانہ پر، اور روک ہے آنے جانے پر
ہاں وقتِ طلوعِ مہر ہے یہ، ہاں وقتِ طلوعِ گلابی ہے

عمر خیام

در دہ مئے لعل و لالہ گوں اے ساقی
بکشائے ز حلق شیشۂ خوں اے ساقی
کامروز بروں ز جام مے نیست مرا
یک دوست کہ پاک اندروں اے ساقی

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

جب دوست بھی اپنے ساتھی بھی، باطن کی صفا سے خالی ہیں
اخلاص بھی ان کا خیالی ہے اور مہر و وفا سے خالی ہیں
پھر جام و سبو ہی اک شے ہے، تابندہ دروں اس دنیا میں
ہیرے بھی وگرنہ پتھر ہیں، جو من کی ضیا سے خالی ہیں

عمر خیام

بشکفت شگوفہ ئے بہار اے ساقی
دست از عملِ زہد بدار اے ساقی
زان پیش کاجل کمین کند روزی چند
جامِ ئے لعل و روی یار اے ساقی

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

ہے موسمِ گل پیانہ اٹھا، برسے ہیں شگوفے سبزے پر
پرہیز کا یہ ہنگام نہیں، ہیں رنگ نمو کے سبزے پر
آخر کو اجل کی کمندیں ہیں اور موت کے ظالم پھندے ہیں
پی، رقص میں آ، نغمات سنا، ہاں دھوم مچادے سبزے پر

عمر خیام

ہاں تا بخرابات مجازی نائی
تا در قلندری نسازی نائی
ایں راہ، رہِ مردانِ سر افرازاں است
زنہار درین کوچہ ببازی نائی

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

تو کھیل اسے سمجھا تو نہ آ، میخانہ تماشا گاہ نہیں
رندوں کی حقیقی دنیا میں، بازی گرِ آہ و واہ نہیں
اس بے غرضوں کے معبد میں، رندانِ جہاں کی رفاقت کر
انساں کی سرافرازی ہے یہاں، کچھ پست و بلند جاہ نہیں

عمر خیام

برسنگ زدم دوش سبوی کاشی
سرمست بدم کہ کردم این او باشی
بامن بزبانِ حال ی گفت سبو
من چون تو بدم تو نیز چون من باشی

ڈاکٹرسلیم واحد سلیم

پتھر پہ سبو کو دے مارا، کل رات وفورِ مستی میں
محسوس ہوا جیسے کہ لہو، بہہ نکلا ہو خاک بستی میں
کہتا تھا زبان حال سے وہ، صد پارہ سبو کی بات سنو
کوزے کی طرح تو بھی ہے یہاں انجام ونمود ہستی میں

عمر خیام

جاناں بکدام دست برخاستہ ای
کز طلعتِ خویش ماہ را کاستہ ای
خوبانِ جہاں بہ عید رو آرایند
تو عید بروئی خویش آراستہ ای

ڈاکٹرسلیم واحد سلیم

یہاں طلعتِ حسنِ زیبا سے، یہ چاند ستارے چمکے ہیں
ذروں میں اک ایسی تابش ہے، گلشن کے نظارے چمکے ہیں
آرائشِ رخ کرتے ہی رہیں، خوبانِ جہاں تہواروں پر
تو سب سے سوا ہے تجھ سے تو تہوار بھی سارے چمکے ہیں

عمر خیام

گر دست دہد زمغز گندم نانے
و ز مے دو منے ز گوسفندے رانے
با ماہ رخے نشستہ در ویرانے
عیشی است کہ نیست حد ہر سلطانے

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم

حاصل ہو اگر سیری کے لیے، جو کچھ بھی ضروری ہوتا ہے
وافر ہو فروغ بادہ بھی، تو ذرہ بھی نوری ہوتا ہے
ہو ساتھ خرابا میں بھی اگر، اک ماہ جبین و خوب نظر
عیسیٰ نفسی سے بڑھ چڑھ کر، پھر کیفِ ظہوری ہوتا ہے

☆☆☆

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم معاصرین کی نظر میں

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم کی آزاد نظم نے مجھے واقعتاً بے حد متاثر کیا۔ ویسے اصولاً میں آزاد نظم کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتا اس کو میں اپنی علمی کوتاہی پر معمول سمجھتا ہوں لیکن شاید یہ پہلی نظم ہے جس نے مجھے اس قدر اپنی طرف کھینچ لیا کہ میں اس کشش پر روشنی ڈالنے سے قرار واقعی طور پر قاصر ہوں۔ اس کی تکنیک کچھ اس انداز کی ہے جو دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔

.. نظیر حسنین

صدر شعبہ اردو

گورنمنٹ کالج سکھر (منقول از ادبی دنیا)

تجزیاتی نقطۂ نظر سے اسلوب کی شگفتہ کاری اپنے موضوع کو سر بلندی اور ارتقائی پرداز بخشتی چلی جاتی ہے۔ جس میں ایک قسم کی کشش اور جاذبیت پنہاں ہے۔ الفاظ کا مناسب چناؤ موضوع کو واضح کرتا چلا جاتا ہے۔ اور اس کی گرہیں خود بخود یکے بعد دیگرے کھلتی چلی جاتی ہیں ہم کسی الجھن یا مبہم استادیت کے شکار نہیں ہو پاتے کہ خود شاعر کی پختہ کاری اور فنی چابکدستی نے موضوع کو بڑی عمدگی سے نبھایا ہے جو اس کی شاعرانہ عظمت اور فنی شعور کا غماز ہے۔

.. (منقول از ادبی دنیا)

پروفیسر افتخار احمد

فخر دہلوی

....

شاعر کی رائے

سبھی گانے والے ماتروں میں گاتے ہیں۔ لکھنے والے کے من میں ڈوب کر کوئی گاتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم واحد سلیم صاحب کا تعلق محض ماتروں سے نہیں۔

.عبدالمجید بھٹی

....

ایک دانش کدہ کے سربراہ کی رائے

محترم ڈاکٹر سلیم واحد سلیم نے عمر خیام کی رباعیوں میں اپنی سحر انگیز شعری و فکری شخصیت کا پرتو سمو کر خیام کی مردہ شعری دنیا کو از سرِ نو زندہ کر دیا ہے دوسرے لفظوں میں کیف و وجد و سرور کی ایک نئی دنیا پیدا کر دی ہے۔ خیام کو عرصہ دراز سے پڑھ رہا ہوں۔ مصر و شام اور دیگر بلادِ اسلامیہ کے عربی تراجم نظم اور نثر بھی پڑھے ہیں مگر جو کیف سرور اس منظوم ترجمہ سے حاصل ہوا الفاظ کی تنگ دامانی اس کے اظہار سے قاصر ہے۔

میں نے بمع اپنی بیگم کے اس مائدہ لذت سے بقدر لب و دنداں استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے اور ہماری خواہش ہے کہ مرقع بے مثل جلد از جلد زیور طبع سے آراستہ ہو کر اہل شوق اور بادۂ عشق کے پرستاروں۔ کے لیے روح افزا و طرب انگیز بنے کیونکہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ''توحید حق بیان نظر بلند ساخت- برتر نہاد پایۂ عرش جلیل را'' کا مفہوم پیدا کر دیا ہے۔

.. فروغ احمد و بیگم فروغ احمد

پرنسپل جامعہ شرقیہ (عربک کالج) اٹل پور

پنجاب پبلک لائبریری کے لائبریرین کی رائے

عمر خیام کی رباعیات کا منظوم اردو ترجمہ جو ڈاکٹر سلیم واحد سلیم کی کاوش فکری اور شعری کا نتیجہ ہے دل و دماغ کے لیے دائمی کیف کا پیغام ہے۔ قاری کے لیے چاہے وہ کسی بھی درجے کا ہو اس منظوم ترجمہ کے سحر سے بچنا محال ہے اس ترجمہ کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ تخلیقی کارنامہ ہے۔ انھوں نے خم کدۂ خیام کو وہ رنگ و روپ بخشا ہے جس کی مثال پوری دنیا کے ادب میں نہیں ملتی۔

کمال یہ ہے کہ ڈاکٹر سلیم واحد سلیم صاحب نے عمر خیام کی رباعیات کی حکیمانہ روح کو نہ صرف اپنے شعری ترجمے میں برقرار رکھا بلکہ اسے بنایا سنوارا اور آفاقی وسعتیں دے کر بنی نوع انسان کے لیے ایک پیغام بنادیا۔ یہ شعری ترجمہ اردو ادب میں منفرد حیثیت کا حامل ہے اور ایک گرانقدر اضافہ ہے۔

میں بلا خوف تردید یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اردو ادب میں اس سے پہلے جتنے ترجمے ہوئے ہیں وہ ان کیف دوام کے حامل شعری جرعات کے مقابلے میں جام سفالین میں آب سادہ سے بڑھ کر کوئی درجہ نہیں رکھتے۔

.. سردار مسیح گل-ایم اے ایم او ایل

لائبریرین پنجاب پبلک لائبریری

....

ایڈیٹر نقوش کی رائے

اتفاق کی بات ہے کہ اسی 1967 میں عمر خیام کی رباعیات کا منظوم ترجمہ (غیر مطبوعہ) صفی لکھنوی مرحوم کے ہاں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ آج ڈاکٹر سلیم واحد سلیم صاحب نے عمر خیام کی رباعیات کا منظوم ترجمہ دکھایا۔ لطف صفی مرحوم کے ترجمہ میں بھی آیا تھا اور اس میں بھی آیا۔ ایک کیفیت اس میں بھی تھی اور ایک اس میں ہے۔ اس میں استادانہ شان زیادہ تھی۔ اس میں تڑپ زیادہ ہے۔ اس میں سوجھ بوجھ زیادہ تھی اس میں مفکرانہ شان زیادہ ہے۔

صفی لکھنوی کا لکھنؤ یاد آ گیا۔ پھر اس میں معدوم ہونے والا ایک بڑا شاعر یگانہ چنگیزی، حالات نے یگانہ کا بھی ساتھ نہیں دیا۔ ڈاکٹر سلیم واحد سلیم کا بھی نہیں دے گا۔ یہ دکھ اس وقت اور بھی بڑھ گیا کہ جب ڈاکٹر صاحب نے مجھے عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ دکھایا۔ اس لیے کہ یہ اتنا مشکل کام تھا کہ جو بڑے بڑے عالموں اور فاضلوں کے بھی بس کا نہ تھا۔

خیام تقریباً 700 برس پہلے پیدا ہوا۔ اس کے سوچنے کا انداز اس وقت کا تھا مگر وہ

اپنے زمانے میں اپنے زمانے سے آگے ہی تھا۔ مگر پھر بھی 700 برس کا وقفہ بڑا وقفہ ہے۔ ڈاکٹر سلیم واحد سلیم صاحب نے اس انداز سے ترجمہ کیا ہے اور اس میں ایسے سائنسی مطالب کو بھی پیش نظر رکھا ہے کہ اس زمانے کی ساری ایسی کوتاہیوں کا بھی ازالہ کر دیا ہے۔

.. محمد طفیل

....

ایڈیٹر سیارہ

"خیام" سے دو آتشہ ہے کہ آتش اول خیام کہن کے میکدۂ فارس سے اور آتش ثانی خمخانہ سلیم سے سیال ہوتی ہے بادہ کہن کا لطف روایتی یا شنیدنی ہے مگر بادۂ نو کا مزہ دیدنی بلکہ چشیدنی ہے۔ دو جرعے چکھ لینے میں مضائقہ؟

خیام کہن

زاہد بہ زن فاحشہ گفتا مستی
کز خیر گسستی و بہ شر پیوستی
زن گفت چناں کہ می نمایم ہستم
تو نیز چناں کہ می نمائی ہستی

خیام نو

ایک فاحشہ سے زاہد نے کہا یہ مستی فسق وفجور ہے
یہ شر سے ہے جو پیوند تیرا اور خیر سے جو یہ دوری ہے
شوخی سے جواب اس نے یہ دیا جو کچھ ہوں دکھائی دیتی ہوں
کیا آپ کے ظاہر باطن میں یکساں ہی شراب طہوری ہے

.. فضل من اللہ

17 نومبر 1978

....

مدیر ادب لطیف

عمر خیام کی رباعیات یوں تو متعدد بار اصل اور ترجموں کی شکل میں پڑھ کر محظوظ ہوا ہوں مگر جناب ڈاکٹر سلیم واحد سلیم نے جو عمر خیام کی پونے دوسو رباعیوں کا منظوم ترجمہ کیا ہے اسے حال ہی میں از اول تا آخر پڑھنے اور مستفید ہونے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم کا کمال یہ ہے کہ جس طرح خیام نے ڈیموکریٹز اور اپی کیورس کے نظریۂ حیات و کائنات کو وحدت الوجود کے نظریے کے ساتھ ہم آہنگ کر کے روحانی مسرتوں کی حصول کی گنجائش پیدا کی تھی ڈاکٹر سلیم واحد سلیم صاحب نے اصل اپی کیورین فلسفے میں یہ کہہ کر تکمیلی مدارج طے کیے ہیں کہ مسرت اجتماعی ہونی چاہیے جو اقتصادی مساوات کے بغیر ممکن نہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے ترجمے کے لیے نہایت مترنم بحر اختیار کی ہے اور مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ انھوں نے نہ صرف فلسفۂ عمر خیام کو اپنے ترجمے میں سمو دیا ہے بلکہ اکثر جگہوں پر تو ترجمہ شعری و فکری لحاظ سے اس قدر بڑھ گیا ہے کہ خیام کی رباعیات بے کیف لگتی ہیں۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کے اس ترجمے کو پڑھ کر فی الواقعی ایک نیا لطف، ایک نیا کیف اور ایک نیا انداز فکر و نظر ملا ہے اور مجھے یقین کامل ہے کہ اردو ادب کے سنجیدہ قارئین بھی اس منظوم ترجمے کو پڑھ کر انہی احساسات و جذبات سے دوچار ہوں گے جس کا اظہار میں نے کیا ہے اور اس منفرد منظوم ترجمے کو بقائے دوام حاصل ہوگا۔

—— ناصر زیدی

ایک ماہر تعلیم کی رائے

رباعیات عمر خیام کئی بار پڑھیں۔ اس کے رموز و نکات پر بھی غور کیا مگر ڈاکٹر سلیم واحد صاحب کا ترجمہ رباعیات پڑھنے کے بعد فکر کی نئی راہیں کھلتی نظر آئیں۔ کچھ ایسے معنوی موتی ڈاکٹر صاحب کے بحر فکر سے ملے ہیں کہ ان پر برسوں تحقیق کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تا کہ ان کی آب و تاب سے دنیا مستفید ہو سکے مجھے یقین ہے کہ دنیائے ادب انھیں شاعر و مفکر دونوں حیثیتوں سے اس منظوم ترجمے پر بھی خراج تحسین ادا کرے گی۔

آقا بیزار

15 نومبر 1968

....

مدیر "ادبی دنیا" کی رائے

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم صاحب نے حکیم عمر خیام کی روح میں ڈوب کر فارسی رباعیات کو اردو اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے اور کمال یہ کیا ہے کہ اسے آج کی چیز بنا دیا ہے گویا پرانی شراب کو نئے پیمانوں میں بھر دیا ہے جن کی تابنا کی نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی ہے۔

۔۔محمد عبداللہ قریشی

ایک نقاد کی رائے

ترجمہ اصل سے بڑھ گیا ہے۔ اگر آج عمر خیام زندہ ہوتا اور سلیم واحد سلیم کا زیرِ نظر ترجمہ پڑھتا تو اس کی رائے اس سے مختلف نہ ہوتی۔

فٹز جیرالڈ کے ترجمہ سے لے کر اردو میں تاثیر اور ترجموں تک کوئی شخص بھی خیام کی روح کو ترجمہ میں نہ سمو سکا تھا مگر ڈاکٹر سلیم واحد سلیم نے اس سے بھی بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف خیام کی رباعیات کو جمالیاتی جوہر اور شعریت کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے۔ بلکہ اس کی رباعیوں کو نئی رفعتوں، رعنائیوں اور گہرائیوں سے ہمکنار کر دیا ہے۔ خیام کے اشعار، علامتوں اور تشبیہوں کو داخلیت اور ذات کے محدود معانی سے نکال کر انسان کی اجتماعی فکر میں تبدیل کر دیا ہے ان کے شعری ترجمہ میں جہاں خیام کی روح موجود ہے وہیں ان کی فکری contribution نے خیام کو نئی زندگی بخش دی ہے۔

ستار طاہر

....

سلیم واحد سلیم کی شاعری سے متاثر تو ایک عرصے سے ہوں اور ان سے ایک محبت کا رشتہ بھی ہے۔ عمر خیام کی رباعیات میں چند کا منظوم ترجمہ دیکھنا آج نصیب ہوا۔ ترجمہ اور پھر منظوم ترجمہ بہت مشکل کام ہوتا ہے خیام کی رباعیات کا فٹز جیرالڈ کا ترجمہ بھی بڑے چاؤ سے پڑھا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کے قطعات میں خیام اردو میں شاعری کرتا نظر آتا ہے۔ چند رباعیات نے جلوہ کا سماں پیدا کر دیا ہے۔ اس جلوہ کی شدت کچھ کم ہو تو مزید رباعیات کا ترجمہ (اور اب اسے ترجمہ کہنے کو جی نہیں چاہتا) دیکھ سکوں تو کچھ کہہ پاؤں۔

۔۔عدیل عباسی 18 مارچ 1976

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیاتِ اکبرالہٰ آبادی (جلد دوم)

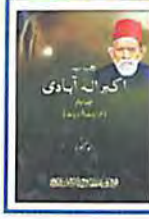

مرتب : احمد محفوظ

صفحات:824

قیمت : -/257روپے

شاعری کی تنقید

مصنف: ابوالکلام قاسمی

صفحات:327

قیمت : -/90روپے

کلیاتِ مُلّا رموزی (جلد اوّل۔حصہ اوّل)

مرتب : خالد محمود

صفحات:453

قیمت : -/151روپے

کلیاتِ مُلّا رموزی (جلد اوّل۔حصہ دوم)

مرتب : خالد محمود

صفحات: 444

قیمت : -/140روپے

کلیاتِ ماجدی

ترتیب وتدوین: عطاءالرحمٰن قاسمی

صفحات:666

قیمت : -/196روپے

معاصر تنقیدی رویے

مصنف: ابوالکلام قاسمی

صفحات:246

قیمت : -/84روپے

₹ 150/-

ISBN: 978-93-5160-030-5

9 789351 600305

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025